UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222478
UNIVERSAL
LIBRARY

TIGHT BINDING BOOK

THE BOOK WAS DRENCHED

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

بیکراں

جگن ناتھ آزاد

مکتبۂ شاہراہ ○ دہلی

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ

پہلی بار نومبر ۱۹۴۹ء

دوسری بار جولائی ۱۹۵۴ء

قیمت :- چار روپے آٹھ آنے

پرنٹر :- محبوب المطابع برقی پریس اردو بازار دہلی
پبلشر :- مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی

ترتیب

پیش لفظ فراق گورکھپوری	۹
طبع ثانی	۱۵
۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء	۱۹
غزل	۲۲
پسِ پردہ	۲۴
غزل	۲۷
نئی محفل	۲۹
غزل	۳۳
جستجو	۳۵
غزل	۳۸
طوفان کے بعد	۴۰
غزل	۴۴
شیشے	۴۶
غزل	۴۸
ایک منظر	۵۰
غزل	۵۲
سرِّ محبّت	۵۴
غزل	۵۷

آزادی کے بعد	٦٠	کلکتہ	١٠٢
غزل	٦٤	کسان	١٠٦
دو آتشہ	٦٦	سوامی رام تیرتھ	١٠٨
رباعیات	٦٨	غزل	١١٢
غزل	٧٠	تاجور نجیب آبادی	١١٤
چاندنی اُتری پھلواری میں	٧٢	اشعار	١١٨
غزل	٧٥	تشکنستلا	١٢٢
کنارِ راوی	٧٧	ایک آرزو	١٣١
غزل	٧٩	فریبِ نظر	١٣٧
اُمید	٨١	استفسار	١٤١
غزل	٨٣	کسولی	١٥١
انڈیا گیٹ	٨٥	گم شدگی	١٥٨
غزل	٨٨	غزل	١٦٠
امیدِ موہوم	٩٠	وطن میں آخری رات	١٦٢
غزل	٩٤	غزل	١٦٦
بورڈ آف انٹرویو	٩٦	سبھاش چندر بوس	١٦٨
اشعار	٩٨	آزاد ہند فوج	١٧٦

غزل	۱۷۸	غزل	۲۱۸
اے دل!	۱۸۰	ماتمِ اقبال	۲۲۰
غزل	۱۸۲	رُباعیات	۲۲۶
سفر میں ایک شام	۱۸۴	تضمینات	۲۲۹
ایک غزل کے چند اشعار	۱۸۶	فرمانِ خدا	
چاندنی رات	۱۸۸	دُعا	
غزل	۱۸۹	محراب گل افغان کے افکار	
قطعہ	۱۹۳	خودی	
اشعار	۱۹۴	عشق	
لارنس باغ میں ایک لمحہ	۱۹۸	سلطان ٹیپو کی وصیت	
غزل	۲۰۱	نذرِ اقبال	۲۴۵
کنارِ راوی	۲۰۳	ٹیگور کی موت پر	۲۴۶
غزل	۲۰۶	غزل	۲۴۹
بیڑا کون لگائے پار	۲۰۸	رُباعیات	۲۵۴
تلاش	۲۱۰	غزل	۲۵۹
غزل	۲۱۳	ذرا مرے قریب آ	۲۶۱
جوشش کے بعد	۲۱۵	غزل	۲۶۳

سلام	۲۶۵	غزل	۳۰۰
بسم	۲۶۸	نیا دور نئے رہزن	۳۰۲
ٹانک	۲۷۲	پناہ گزیں	۳۰۶
سازِ ہندی	۲۷۴	غزل	۳۰۹
اصغر بشیر	۲۷۷	شاعر	۳۱۱
غزل	۲۷۸	غزل	۳۱۵
فریبِ نظر	۲۸۰	آزاد و اقبال	۳۱۸
اشعار	۲۸۲	غزل	۳۲۱
غزل	۲۹۳		
دائرے	۲۹۵		
سکوت	۲۹۸	اُردو	۳۲۳ ۳۵۲

پیش لفظ

سچے معنوں میں بحیثیتِ شاعر مشہور ہونا ہر دَور میں ایک مشکل امر رہا ہے۔ فصیح اور بے عیب کہنے والوں کی اکثریت بھی مشہور نہیں ہو سکی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہُوا ہے کہ شروع میں تو نام اُچھلا اور نگاہیں اُٹھیں لیکن شہرت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ کامیابی ایک عام بدنصیبی ہے۔ لیکن کم عمری میں کامیابی نصیب ہونا سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ بہرحال شاعری میں ایسی کامیابی جو ثابت قدم بھی ہو اور ترقی پذیر

بھی، کم یاب ہے۔ پھر جب ہم دورِ حاضر کی بلند پایہ اُردو شاعری کے نمونوں اور مطالبوں پہ نظر ڈالتے ہیں تو کسی شاعر کا اپنے لئے خاص جگہ پیدا کرنا ہر لحاظ سے قابلِ توجہ کارنامہ ماننا پڑتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے دورِ حاضر کی اردو شاعری میں اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے۔ اس کا ہر صاحبِ ذوق کو خوشی اور بے تکلف اعتراف ہوگا۔

فرانس کے سب سے بڑے نقاد سین بیو نے کہا ہے کہ جب میں کوئی کتاب پڑھتا ہوں تو پہلے اس کتاب کے ادبی و فنی و فکری محاسن پہ نظر نہیں ڈالتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ اس کتاب کا مصنف کتنا اچھا آدمی ہے۔ نیکی و شرافت جو زندگی کے سب سے بڑے جوہر ہیں ادب و شاعری کے بھی سب سے قیمتی جوہر و عناصر ہیں۔ حقیقی ادبی تخلیق حقیقت میں ایک اخلاقی عمل ہے۔ آزاد کی شاعری میں جو صفت سب سے زیادہ جاذبِ نظر اور سب سے زیادہ دل کش ہے وہ آزاد کی وہ نیکی اور انسانیت ہے جس میں تصنع کا نام نہیں۔ زندگی کا یہ خلوص ہی آزاد کی شاعری کا محرک اور خلاق ہے۔ آزاد کے خیالات اور ان کے لہجے میں سچی انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔

آزاد بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ان کے والد تلوک چند محروم جتنے اچھے اور پختہ کار شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے اور قابلِ احترام انسان بھی ہیں آزاد نے بلند سے بلند جو مغربی و مشرقی تعلیم و تہذیب اس زمانے میں حاصل کی جا سکتی ہے اُسے کامل طور پر حاصل کیا ہے۔ لیکن ان کی تربیت میں غالباً کیا یقیناً جس چیز نے سب سے بڑا حصّہ لیا ہے وہ حضرت محروم کی "نظر" نے اور اُن کے سنجیدہ کردار کی خاموش فضا اور ماحول نے۔ ایسے غیر شعوری اثرات زندگی کو سنوار دیتے ہیں۔ آزاد بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لیکن اُن کی بلند تعلیم اس مرکزی اثر کے سانچے میں ڈھلی ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ ایسے جوانِ صالح اس دور کے لئے اور ہر دور کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آزاد کی انسانیت پر رشک کیا جائے یا قابلیت پر یا اُن کی اس شاعری پر جو نہ جانے کیوں رہ رہ کر دلوں کو کھینچتی ہے۔

آزاد کی غزلیات، رباعیات، قطعات اور نظمیات کو خواہ سرسری طور پر کوئی پڑھے خواہ غائر طور پر، یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد کی آواز بیک وقت نرم، متوازن اور مردانہ وار ہے۔ لہجہ بیک وقت سنجیدہ و حسّاس ہے۔ خیالات، جذبات، تقلب و نظر اس تربیت و تہذیب کا پتہ دیتے ہیں جس کی جتنی بھی قدر

کی جائے کم ہے۔ الفاظ و بیان میں قابلِ رشک شستگی ہے۔ ان کے ہر شعر کے آئینے میں ان کا کردار جھلک رہا ہے اور ان کے سجل دل و دماغ بھی۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ اُن کا کلام برابر ترقّی کرتا ہُوا نظر آتا ہے۔ سطحیت تو اُن کے کلام میں کہیں ہے ہی نہیں۔ ایک بڑھتی ہوئی گہرائی جس میں برابر تہیں پڑتی جا رہی ہیں، ایک بلندی جو نئی منزلیں تلاش کر لیتی ہے، ایک ایسی تنقیدِ حیات جو سادہ و پُرکار ہے، ایک ایسا اندازِ بیان جو چونکہ بے تصنّع ہے اس لئے بے حد دل کش ہے، زندگی سے، انسانیت سے، کائنات سے فطری اور پُرخلوص لگاؤ، ایک چوٹ کھایا ہُوا دل جس نے اپنی چوٹ کو قبول کر لیا ہے۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جو آزاد کی شاعری کو امتیازی رنگ عطا کرتی ہیں۔

تقسیمِ ہندستان نے حضرتِ محروم سے ضعیفی میں اور آزاد سے جوانی میں اُن کا محبوب خطّۂ وطن مغربی پنجاب چھڑوا دیا۔ اس سانحے نے آزاد کی شاعری میں ایک نئی کسک اور نیا چٹیلا پن پیدا کر دیا ہے۔ چھوٹے ہُوئے وطن کی محبّت نے اُن کی معصوم و پُرخلوص ہنسی میں آنسوؤں کی چاشنی اور اُن کے آنسوؤں میں تبسّم کی جھلک پیدا کر دی ہے۔ اس سے اُن کا کلام اور بھی چمک اُٹھا ہے۔ دِلّی اُجڑنے کے بعد جو شعرائے دِلّی لکھنؤ آ بسے تھے یا لکھنؤ اُجڑنے کے بعد

جن شاعروں کو رامپور و حیدرآباد کا مُنہ دیکھنا پڑا، اُن کے کلام میں اپنی جنم بھوم کے لئے اتنے چٹیلے اشعار نہیں ملتے جتنے آزاد کے کلام میں پنجاب کی یاد سے پیدا ہوئے اشعار ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جس خلوص سے آزاد نے نئے اور اجنبی ماحول کو اپنایا ہے وہ بھی قابلِ صد ہزار تحسین ہے۔

سوچا تو میں نے یہ تھا کہ کلامِ آزاد سے جستہ جستہ نمونے پیش کر کے ہر ٹکڑے پر کسی قدر تفصیل سے اظہارِ خیال کروں اور اس طرح اپنے ذوقِ سخن پر احسان کروں۔ لیکن اتنی فرصت نہیں نکال سکا۔ پھر بھی آزاد کے مجموعۂ کلام کے ساتھ یہ پیش لفظ چھپ رہا ہے۔ اس لئے شائقین اس مختصر عبارت کو پڑھ کر جب اس مجموعے کے اوراق پلٹیں گے تو آزاد کے کلام کی چمک دمک خود نگاہوں کے سامنے آ جائے گی۔ مشک آنست کہ۔۔۔۔۔۔

ایک آدھ بات اور کہہ لینے دیجئے۔ آزاد کے تخیّل اور فن اور اُن کی ذہنی نشو و نمو کو سیراب و شاداب کرنے والے ایک طرف بلند ترین مغربی ادب اور علوم ہیں اور دُوسری طرف رچے ہوئے فارسی ادب اور اردو ادب کے کارنامے ہیں۔ علم و ادب کی دُنیا کے وُہ بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔ ان کی ہونہار اور سلامت رو شاعری کے لئے ابھی بہت بڑے امکانات ہیں

ان کی شاعری کا مستقبل تابناک ہے اور یہ مجموعہ مہر نیم روز کے طلوع کا پتہ دیتا ہے۔ ہمیں آزاد کی شاعری سے ابھی بہت اُمیدیں ہیں۔ آزاد کی شاعری کی جڑیں گہری ہیں۔ اُٹھان نہایت شاندار ہے اور اس کی تکمیل اور بھی زیادہ شاندار ہوگی۔ یہ شاعری کتابی شاعری نہیں ہے بلکہ زندگی کی آواز ہے، ایک چوٹ کھائے ہوئے مگر سوچنے والے دل کی پکار ہے اور ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جسے شعر کہنا آتا ہے۔

الہ آباد

۱۱ستمبر ۱۹۴۹ء

فراق گورکھپوری

طبع ثانی

"بیکراں" کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا اور ایک برس سے کم مدت میں ختم ہو گیا۔ اس دور میں نظم کی کتاب کا اس تیزی سے فروخت ہو جانا میرے لئے ہر اعتبار سے حوصلہ افزا ہے۔ اردو سے محبت رکھنے والوں کی اس توجہ کا ممنون ہوں۔

پہلا ایڈیشن اس قدر رواروی کے عالم میں مرتب ہوا تھا کہ بعض پسندیدہ نظمیں اور غزلیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ سیاسی انتشار اور ذہنی پریشانی کے دوران میں تمام منظومات کو ادھر ادھر سے جمع کرنا میرے لئے آسان نہ تھا۔ اس لئے جن نظموں اور غزلوں وغیرہ کی تلاش میں دقت پیش آئی انھیں نظر انداز کر دیا گیا
جب "ستاروں سے ذرّوں تک" زیر ترتیب تھی تو گم شدہ منظومات میں سے بعض دستیاب ہوئیں لیکن انھیں اس مجموعے میں شامل کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا کیونکہ "بیکراں" سے پہلے کی کہی ہوئی نظموں کی صحیح جگہ "بیکراں" ہی تھی نہ کہ اس کے بعد کا مجموعۂ کلام۔ "بیکراں" ۱۹۴۹ء کی ابتدا تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ اور "ستاروں

سے دَوروں تک، اُس وقت سے ۱۹۵۰ء کی ابتدا تک کے کلام پر۔ اس التزام کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ یہ نظمیں اور غزلیں میں "بیکراں" کے دُوسرے ایڈیشن تک اُٹھا رکھتا۔ مجھے خوشی ہے کہ آج مجھے اپنی خواہش کے مطابق یہ نئی نظمیں اہلِ ہند و پاکستان کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔

"بیکراں" کے پہلے ایڈیشن کی تمام نظمیں، غزلیں، قطعات و رباعیات اس ایڈیشن میں موجود ہیں۔ شاید ہی میں نے کوئی شعر اس میں سے حذف کیا ہو۔ نئی نظموں اور غزلوں کے اضافے کے باعث کتاب کی ضخامت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اب اس اطمینان کے ساتھ کہ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر ہی نہیں بلکہ کسی حد تک زیادہ مکمّل بھی ہے، میں "بیکراں" کا دُوسرا ایڈیشن اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ع

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من

دہلی
۷ مارچ ۱۹۵۱ء

آزاد

سحر در شاخسار بوستانی
چه خوش می‌گفت مرغ نغمه‌خوانی
برآور هر چه اندر سینه داری
سرودی، ناله‌ای، آهی، فغانی

اقبال

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ مے خانہ یہ مے خانوں پہ کیا گزری

فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں اُن کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و بو سے بھرپور بستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیسا یہ اپنوں کو بیگانوں پہ کیا گزری

قطعہ

وطن کی اے مقدس سرزمیں احساس بھی کچھ ہے
کہ تجھ سے چھوٹ کے تیرے سوختہ جانوں پہ کیا گزری
تجھے اے کاش دہلی اور شملہ یہ بتا سکتے
میانوالی کے صحرا میں تیرے دیوانوں پہ کیا گزری

غزل

اے دوست! تری یاد نے بخشا وہ سہارا
ہر تلخیٔ دوراں کو کیا ہم نے گوارا

جیتی ہوئی بازی کو پھر اک بار وہ ہارا
یوں دل نے لیا تیری نگاہوں کا سہارا

انکار کریں گے جو کنارے نے پکارا
ہے عشق کی توہین کنارے کا سہارا

ہم شوق میں منزل سے بھی آگے نکل آئے
معلوم نہیں روح کو یہ کس نے پکارا

ہر منزلِ دشوار کو آسان بنایا
کیا چیز ہے اے ذوقِ نظر تیرا سہارا

محتاج ہے اے عشق! فقط ایک نظر کا
تاروں کا نظارا ہے کہ پھولوں کا نظارا

کچھ جیت کا احساس ہے، کچھ ہار کا احساس
معلوم نہیں اصل میں جیتا ہوں کہ ہارا

میخانہ بدوش آئیں گلستاں پہ گھٹائیں
پاتے ہی تری مست نگاہوں کا اشارا

اے عقل! خدا تیرے سفینے کا محافظ
یہ عشق کا دریا ہے نہیں جس کا کنارا

گلشن بھی ترے اور بہاریں بھی تری ہیں
آزاد کا حصّہ ہے فقط زخمِ نظارا

پسِ پردہ

خیال تھا کہ صبحِ نو اُفق پہ جگمگائے گی
ہر اک بلند و پست پر نشاط بن کے چھائے گی
قریب و دُور تک ردائے نُور پھیل جائے گی
فلک بھی مُسکرائے گا زمیں بھی مسکرائے گی
کچھ اپنا رنگ اِس طرح یہ صبحِ نَو جمائے گی

خیال تھا کہ اک بہارِ نو چمن میں آئے گی
چمن میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جائے گی
جمود سے حیاتِ گلستاں نجات پائے گی
خزاں کا دور جائے گا بہار رنگ لائے گی
زمین گنگنائے گی حسین گل کھلائے گی

خیال تھا کہ ظلمتوں سے ہم رہائی پائیں گے
خیال تھا کہ اپنے گھر کو اپنا گھر بنائیں گے
خیال تھا کہ مل کے جشنِ دورِ نو منائیں گے
خیال تھا کہ زندگی نجات غم سے پائے گی
خوشی کے ایک بحرِ بیکراں میں ڈوب جائے گی

خبر نہ تھی کہ وہ سحر نظر کو جس کا شوق ہے
ہر ایک راہرو کو رہ گذر کو جس کا شوق ہے
ہمارے بحر و بر کو خشک و تر کو جس کا شوق ہے
جب آئے گی تو ظلمتوں کی سیل ساتھ لائے گی
قریب و دور پر مہیب رات بن کے چھائے گی

خبر نہ تھی بہار جس کی آرزو چمن کو ہے
بہار جس کی جستجو چمن کے بانکپن کو ہے
بہار جس کا انتظار سنبل و سمن کو ہے
جب آئے گی تو موج زہرناک ساتھ لائے گی
خزاں کی طرح آئے گی چمن میں پھیل جائے گی

غزل

ترتیبِ نشیمن کیا ہو گی آئینِ گلستاں کیا ہوگا
آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

اندازۂ طوفاں ہوتا ہے طوفاں کے قریب آجانے سے
ساحل پہ بسیرا کرنے سے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

یہ گلشن تو ہے گلشن تو اے فکرِ کہن کے دیوانو!
بیمارِ تفکر آخر اس گلشن میں غزل خواں کیا ہوگا

اس دور میں بھی کام آئیں گی صدیوں کی یہ فرسودہ باتیں

اے پیرِ دبستاں بول ذرا دستورِ دبستاں کیا ہوگا

جب مرغِ خوش الحاں دام و قفس انعام ہو خوش الحانی کا

پھر نغمہ سرا گلزاروں میں تو اے مرغِ خوش الحاں کیا ہوگا

جس غم سے تسکیں ملتی ہو اُس غم کا مداوا کون کرے

جس درد میں لذت پنہاں ہو اُس درد کا درماں کیا ہوگا

تہذیب کا پرچم لہرایا ہر شہر و چمن ویران ہوا

تعمیر کا ہے ساماں جو یہی تخریب کا ساماں کیسا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلایا حال کا آئینہ

کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیسا ہوگا

اُٹھ چھا گئے والے وقت ہے یہ ہاں صحنِ چمن سے بچ کے نکل

جب باغ قفس بن جائے گا اُس وقت گریباں کیا ہوگا

نئی محفل

جس کا جشن تقسیم ہند کے بعد بہ یک وقت
ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہوا

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا
نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا

چمن بدلا چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے
یہاں اب ہم پرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ہر سنگ پارے کو گہر کی شان حاصل ہو
نوادر ہم وہاں جا کر لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں چاروں طرف سے آندھیاں مذہب کی چلتی ہوں
وہاں ہم عقل کی مشعل جلائیں بھی تو کیا ہو گا

جہالت کے جہاں پتھر ہی پتھر راستے میں ہوں
وہاں ہم نطق کا دریا بہائیں بھی تو کیا ہو گا

خرد دشمن جہالت آفریں ماحول میں اے دل
ترانے ہم تمدّن کے جو گائیں بھی تو کیا ہو گا

جنہیں ذوقِ نظر بخشا گیا تھا ہو چکے رخصت
ہم اب تارے فلک سے توڑ لائیں بھی تو کیا ہو گا

جہاں ذوقِ ادب کے نام سے دنیا بدکتی ہو
وہاں اب ہم ادب کے راگ گائیں بھی تو کیا ہو گا

جہاں انسان کو اونچے تخیّل سے عداوت ہو
وہاں ہم موجِ بیت تانیں اڑائیں بھی تو کیا ہو گا

دلوں کا غیظ جب اے دوست! چہروں پر نمایاں ہو
گلے شکوے زباں پر ہم جو لائیں بھی تو کیا ہو گا

جنوں ہی کارفرما ہو جہاں اطرافِ عالم میں
وہاں ہم عقل کی محفل سجائیں بھی تو کیا ہو گا

جہاں ماحول پر نفرت ہی نفرت راج کرتی ہو
وہاں ہم پیار کی دنیا بسائیں بھی تو کیا ہو گا

جہاں ہمدردیوں کا نام تک باقی نہ ہو دل میں
وہاں ہم درد کی دولت لٹائیں بھی تو کیا ہو گا

تو گہری نیند میں ہے جاگنا آساں نہیں تیرا
ہم اے مرشد ترے شانے ہلائیں بھی تو کیا ہو گا

تجلّی کا اب اس ماحول میں طالب نہیں کوئی
اندھیری رات میں ہم جگمگائیں بھی تو کیا ہو گا

جہاں ماحولِ انساں پہ سکوتِ مرگ طاری ہو

وہاں ہم حوصلوں کو آزمائیں بھی تو کیا ہو گا

جب اِس محفل میں سُننے پر نہیں ہے کوئی آمادہ

تو پھر ہم نطق کا جادو جگائیں بھی تو کیا ہو گا

جہاں آزاد تا حدِّ نظر بنجر زمینیں ہوں

گھٹائیں آن کر بارش لٹائیں بھی تو کیا ہو گا

غزل

اے دل الجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں
منزل کہاں یہ جشنِ سرِ رہ گذر کہاں

اک بار اگر قفس کی ہوا راس آ گئی
اے خود فریب پھر ہوسِ بال و پر کہاں

گم ہو چکی ہے کاہکشاں گردِ راہ میں
اب دیکھئے ہو ختم ہمارا سفر کہاں

مانا چمن میں حکم زباں بندیوں کے ہیں

راز جنوں کو فاش کریں ہم مگر کہاں

گلشن میں خامشی ہے مرے اس سوال پر

ٹھہرے گا کاروانِ نسیمِ سحر کہاں

خس نا شگافیوں کے زمانے گزر گئے

اب ڈھونڈتا ہے شوق کہیں شیشہ گر کہاں

آزاد جس کو کوئی نئی دنیا تلاش کر

جلوے یہاں بقدرِ مذاقِ نظر کہاں

جُستجو

ہوس کو علم و فن کی آڑ میں چھپا رہا ہوں میں
سمجھ رہا ہوں یہ ترے قریب آ رہا ہوں میں
یہ جان کر کہ اپنے آپ کو بنا رہا ہوں میں
ابھی شعورِ خام کا فریب کھا رہا ہوں میں

خیالِ غرقِ آرزو نگاہ محوِ جستجو
پکارتی ہے زندگی کہاں ہے تو کہاں ہے تو
قریب و دور ظلمتیں ہی ظلمتیں ہیں چار سو
یہ اور بات ہے کہ آپ جگمگا رہا ہوں میں

عجیب مقام ہے جہاں کوئی بھی راستہ نہیں
خرد کا آسرا نہیں جنوں کا آسرا نہیں
کہاں ہے منزلِ نظر مجھے کوئی پتہ نہیں
مجھے تو یہ خبر نہیں کہاں سے آ رہا ہوں میں

ادھر فلک کی نیلگوں فضا ادھر سحاب ہیں
شرارہائے ضوفشاں ہیں پیرہن ماہتاب کے
نگاہ پر ابھی تو رنگ رنگ کے حجاب ہیں
اگرچہ مدتوں سے یہ حجاب اٹھا رہا ہوں میں

دو شعر

ہاں حسرت لب قہقہہ آہ سرد ہی سہی
لب تو خندہ ریز ہیں پہلو میں دل نہیں سہی
پاؤں تھک گئے تو کیا آرزو میں دم تو ہے
آنکھیں جھپک تو ہیں رخ پہ گرد ہی سہی

غزل

فضا کو دیکھ کے ذوقِ نظر پہ کیا گذری
نہ پوچھیے ہوسِ بال و پر پہ کیا گذری

تمہیں کچھ اس کی خبر بھی ہے اے چمن والو
سحر کے بعد نسیمِ سحر پہ کیا گذری

یہ کاش تجھ کو بھی ذوقِ نظر بتا سکتا
تری تلاش میں ذوقِ نظر پہ کیا گذری

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا
خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گذری

حضورِ دوست کا عالم بتا نہیں سکتا
میں کیا کہوں مرے قلبِ نظر پہ کیا گذری

نظر تو محوِ غمِ جستجو تھی اے آزاد !
یہ اس کے ساتھ دلِ بے خبر پہ کیا گذری

طوفان کے بعد

۱۹۴۵ء

رات جاتی ہے تو سامانِ سحر ہوتا ہے
مگر اس رات تو سامانِ سحر ہو نہ سکا
ختم گو ہو بھی چکا عالمِ ظلمات کا دور
انجمِ صبح نمودار مگر ہو نہ سکا

جاگتی رات مگر پو نہ پھٹی مشرق میں
تیرہ و تار فضاؤں کی سیاہی نہ گئی
ایک افسانہ ہوا گرچہ خزاں کا عالم
صحنِ گلشن سے بگولوں کی تباہی نہ گئی

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفان گئے
زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد
لیکن اے آرزوئے دید! ذرا غور سے دیکھ
کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

اپنے ماحول سے بیگانہ رہا جوشِ جنوں

عقل منزل کی طرف جا کے پلٹتی ہی رہی

سانس آزاد فضاؤں میں کبھی لے نہ سکی

زندگی موت کے دامن میں سمٹتی ہی رہی

حیف صد حیف کہ انسان کا یہ فکرِ منیر

تُند طوفاں پہ ذرا سا بھی اثر کر نہ سکا

"جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا"

ہم نے مانا کہ ہے طوفان کا مفہوم یہی
زندگی کی شبِ تاریک سحر ہو نہ سکے
اپنی منزل تو نظر آئے خرد کو لیکن
اپنی منزل کی طرف اُس کا گذر ہو نہ سکے

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضا ہے یہی
لڑکھڑاتی ہوئی دُنیا کو سنبھلنا ہے ضرور
تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں
مری بُجھتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

غزل

اب ہیں سرگرمِ تلاشِ منزلِ جانانہ ہم
چھوڑ آئے ہیں حدودِ کعبہ و بت خانہ ہم

مستِ صہبائے نظر ہیں ساقیٔ مے خانہ ہم
ہیں ازل سے بے نیازِ شیشہ و پیمانہ ہم

چاند تارے اب تو گردِ راہ میں گم ہو گئے
کون سی منزل کے عازم ہیں دلِ دیوانہ ہم

یہ فقط آنسو نہیں اے چشمِ ظاہر بینِ دوست!
اپنی پلکوں پر لئے بیٹھے ہیں اک افسانہ ہم

ظلمتِ شب کی قسم پیچ پیچ راہوں کی قسم
ساتھ دیں گے اب ترا اے ہمتِ مردانہ ہم

داستانِ عشق سے رنگیں ہے دل کی کائنات
عشق افسانہ ہے لیکن سرخیٔ افسانہ ہم

زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی گئی
چھیڑ بیٹھے یا الٰہی کون سا افسانہ ہم

بوالہوس اس خاک کا قصہ ہے آ کر دل سے پوچھ
جانتے ہیں عظمتِ خاکسترِ پروانہ ہم

ہم سے اے آزاد حسن و عشق کی رمزیں نہ پوچھ
حسن سے نا آشنا ہیں عشق سے بیگانہ ہم

کہہ دو اے آزاد ہم کو [illegible] دل نوازی [illegible]
بزم ہائے [illegible] ہم

شبلی

اِس بزمِ جہاں کو کیا خبر تھی تیری
جو شام تھی دنیا کی سحر تھی تیری
جس پر نہ پہنچ سکا خیالِ انساں کا
اُس عالمِ بالا پہ نظر تھی تیری

طوفانِ حوادث سے نہ ڈرنے والے
ہنس کھیل کے دنیا سے گزرنے والے
اب کون سے گردوں کا ستارا ہے تو
اے بحرِ عمیق میں اترنے والے

اے رفعتِ افلاک سے آنے والے
عالم کو بس اک جھلک دکھانے والے
اب تک دلِ اہلِ دل میں تیرا ہے مقام
اے بحرِ فنا میں ڈوب جانے والے

غزل

پھر حسنِ خود نما پہ نظر کر رہا ہوں میں
پھر امتحانِ قلب و جگر کر رہا ہوں میں

پھر ہو رہا ہے درہم و برہم سکوتِ شب
نالوں سے چاک شب کا جگر کر رہا ہوں میں

دنیا میں مجھ کو جنسِ وفا کی ہے جستجو
خاشاک میں تلاشِ گہر کر رہا ہوں میں

اب دل کو ناپسند ہے پھولوں کا حسن و رنگ
شاید بلند ذوقِ نظر کر رہا ہوں میں
پھر دل میں آ رہی ہے کسی بے وفا کی یاد
دُنیائے دل کو زیر و زبر کر رہا ہوں میں
اب لطفِ صبح و شام گیا صبح و شام سے
کچھ اس طرح حیات بسر کر رہا ہوں میں
تسکینِ جانِ زار! ترے انتظار میں
گو جاں کنی ہے صبر مگر کر رہا ہوں میں

ایک منظر

سناور کی بلندیوں سے

شاید ہو تجھے تلخیٔ ایام گوارا
دیکھ لے دلِ مشتاق! کسولی کا نظارا
وہ صبح کے دامن میں جھلکتے ہوئے انوار
وہ شام کے ماتھے پہ چمکتا ہوا تارا
کس حسن سے بدمست گھٹاؤں میں ہوا غرق
کہسار کی چوٹی کا فلک بوس کنارا

سرمست ہُوا ہے کہ ہے چلتا ہُوا جادُو

بدمست گھٹا ہے کہ جنوں کو ہے اشارا

لوگوں سے جو سنتے ہیں کہ جنّت بھی کوئی ہے

ممکن ہے کسی نے ہو یہی عکس اُتارا

پستی کو بلندی سے لڑھکتے ہوئے بادل

رفعت کو اُبھرتے ہوئے پانی کا نظارا

شاید تری رفتار سے ٹکرا کے گئی ہے

ملتا ہی نہیں ہے کوئی بدلی کو سہارا

یہ ابر یہ سبزہ یہ ہوائیں یہ گھٹائیں

کثرت نے دکھایا مجھے وحدت کا نظارا

یہ عالمِ پُرکیف و سکوں ریز و جنوں خیز

جنّت کا تصوّر بھی نہیں دِل کو گوارا

غزل

مطمئن ہوں زیست سے زیست بار ہے تو کیا
زہر پی رہا ہوں میں ناگوار ہے تو کیا

عشق کے حضور میں سرخرو تو ہو گئے
دامنِ حیات اگر تار تار ہے تو کیا

اپنی خلوتوں میں تو بے نیاز ہو کے رہ
انتظار میں کوئی بے قرار ہے تو کیا

مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے
کارواں کے ساتھ ساتھ اِک غبار ہے تو کیا
تُو بھی ہے فنا پذیر میں بھی ہُوں فنا پذیر
میں ہُوں گر خزاں تو کیا تُو بہار ہے تو کیا

○

ہیں سامنے فلک ہی فلک بام و در کہاں
یاں اے جنونِ شوق خرد ہمسفر کہاں
لہروں کی زد پہ چھوڑ سفینے کو ناخدا
موجوں کا ہے یہ رقصِ دلآرا بھنور کہاں

سِرِّ محبّت

نہ بُود نقشِ دو عالم کہ رنگِ اُلفت بُود
زمانہ طرحِ محبّت نہ ایں زماں انداخت
(جامی)

اُس وقت بھی یہ راز فضاؤں پہ عیاں تھا
جس وقت نہ دُنیا تھی نہ دنیا کا نشاں تھا
جس وقت ابھی کُن کا اشارہ نہ ہُوا تھا
ظاہر کوئی دُنیا کا نظارہ نہ ہُوا تھا

جس وقت نہ سورج تھا نہ مہتاب نہ تارے
پنہاں کسی پردے میں تھے بجلی کے شرارے

جس وقت نہ گرمی تھی نہ سردی تھی نہ برسات
ظاہر تھے نہ جب شام و سحر اور نہ دن رات

جس وقت نہ موجیں تھیں نہ موجوں کا تلاطم
نے ابرِ خروشندہ نہ باراں کا ترنم

خاموش تھا جب محفلِ فطرت کا ہر اک ساز
اُٹھتی تھی نہ جس وقت کسی چیز سے آواز

جس وقت نہ تجلی تھی نہ بادل نہ بخارات
نے معدنیات اور نہ آثارِ نباتات

جس وقت نہ جنگل تھے نہ صحرا نہ بیاباں
نے رفعتِ کہسار تھی نے وسعتِ میداں

جس وقت نہ گھر کر کبھی آتی تھیں گھٹائیں
ہر وقت تھیں اک حال پہ خاموش فضائیں
جس وقت نہ تارے تھے نہ تاروں میں اشارے
معدوم تھے جب چاندنی راتوں کے نظارے
جس وقت نہ بلبل تھا نہ گل تھا نہ گلستاں
اک حال پہ رہنے سے فضائیں تھیں پریشاں
جس وقت نہ گنگا تھی نہ گنگا کی روانی
نے رودِ راوی نہیں کا مچلتا ہوا پانی
جب صفحۂ ہستی پہ مکیں تھا نہ مکاں تھا
ہنگامہ یہ سب غیب کے پردے میں نہاں تھا
جس وقت نہ دنیا تھی نہ دنیا کا نشاں تھا
اُس وقت بھی یہ راز فضاؤں پہ عیاں تھا

غزل

خرد بھی سرگشتہ و پریشاں اسے کہاں ضبط کا تھا یارا
مرے جنوں کا ہے یہ کرشمہ کہ تیرا غم کر لیا گوارا

دل و نظر کو کسی کی یادِ حسیں نے بخشا ہے وہ سہارا
کہ اب زمانے کا ہر ستم ہے دل و نظر کے لئے گوارا

یہ بات ہی اور ہے کہ ہم کو نہیں یہاں گفتگو کا یارا
وگرنہ یہ بازیٔ محبت نہ حسن جیتا نہ عشق ہارا

وہ دل عطا کر کہ جس کو ہوں پردہ ہائے گردوں بھی ناگوارا

نگاہ وہ دے کہ سنگِ خارا کو چیر کر دیکھ لے شرارا

یہ عالمِ رنگ و بو کو آزاد کون سے ہاتھ نے سنوارا

جنوں کو حیرت ہے عقل گم ہے نظر کا دامن ہے پارہ پارہ

مرے سفینے مرے کنارے یمِ محبت کے تند دھارے

نہ اب سفینے کی آرزو ہے نہ اب نگاہوں میں ہے کنارا

خبر نہیں بات کیا ہے جس سے چمن کے آنسو نکل پڑے ہیں

نہ جانے کیا کچھ بتا گیا ہے چمن کو یہ صبح کا ستارا

جنوں سے طوفاں سے خوف کیسا یمِ محبت میں آ بنا ہے

تری نظر ہے یقیں سے عاری وگرنہ ہر موج ہے کنارا

اگرچہ طوفانِ ابر و باراں فضاؤں پر ہے محیط لیکن

ثبات اپنا دکھا رہا ہے کہیں کہیں کوئی کوئی تارا

تری وفا کا تری محبّت کا موجِ طوفاں اب امتحاں ہے
وہ اپنی رعنائیاں دکھا کر بُلا رہا ہے مجھے کنارا

بہار لائے گی نکہتوں کا جب ایک طوفان تو کیا کریں گے
نہ رنگ و بو تھا نہ زمزمے تھے خزاں میں تو ہو گیا گزارا

نہ حل ہوئیں مشکلیں نظر کی اگرچہ دنیائے رنگ و بو میں
کبھی خرد پر کیا بھروسہ کبھی جنوں کا لیا سہارا

کبھی حوادث سے جنگ کر کے کبھی حوادث میں رنگ بھر کے
جنھیں تھا سودا سنوارنے کا انھوں نے قسمت کو یوں سنوارا

نہ ہو تمنّاؤں میں جو خامی تو کیا ہے گردوں کی پردہ بندی
کہ عشق کی اک نظر جو چاہے تو چیر دے اندرونِ خارا

سنبھال کر ہم نے پھر بھی رکھا ہوا ہے آزادِ غم کسی کا
اگرچہ زورِ جنوں کے ہاتھوں ہے دامنِ دل ہزار پارہ

آزادی کے بعد

گرد دامن سے غلامی کی چھڑانے والے
ترے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے
جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید
وُہ سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے
تو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
تو بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے

آج بھی رُوح میں ہے درد کی دُنیا آباد

دمِ بجود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے

آج بھی دِل میں ہیں بے تابِ تکلّم نالے

اور سینے میں دلِ زار طپاں آج بھی ہے

جلوہ فرمائی پہ حُسن آج بھی آمادہ نہیں

عشق کی ڈوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ہیں محیط

حل طلب مسئلۂ سود و زیاں آج بھی ہے

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں

درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے

یہ الگ بات ہے تو اِس کو نہ دیکھے لیکن

تیرے ماحول میں آہوں کا دُھواں آج بھی ہے

رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں
ایک کا سُود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

آج بھی بندۂ و آقا میں تفاوت ہے وہی
دیدۂ عدل بہر سُو نگراں آج بھی ہے

آج بھی شور فضا میں ہے وہی محنت کا
گوشِ سرمایہ پہ یہ شور گراں آج بھی ہے

نصب باغات میں بُت اب بھی ہیں انگریزوں کے
اور شہنشاہ کا سِکّوں پہ نشاں آج بھی ہے

آج بھی مفت نظر ہے وہی سینوں کا عناد
بند اخلاص و محبّت کی دکاں آج بھی ہے

دین و دُنیا میں کوئی ربطِ بہم ہے کہ نہیں
سوچ میں انجمنِ دیدہ وراں آج بھی ہے

اِس نئے عصر میں انصاف کی اے جنسِ لطیف

صاف کہہ کوئی ترا مرتبہ داں آج بھی ہے؟

کون اِس دور میں ماحول کا ہو شکوہ طراز

نطق پر دُشنۂ احکام رواں آج بھی ہے

ہائے وہ مرے مذاقِ دید کی تابانیاں

رات کی ظلمت کو جب نورِ سحر سمجھا تھا میں

غزل

ہر سانس تھا اک دلکش و رنگین ترانہ
اے کاش کبھی لوٹ کے آئے وُہ زمانہ

وُہ صبح کے آثار نہ وُہ لطفِ صبوحی
وُہ شام کے انوار نہ وہ کیفِ شبانہ

اے سروِ سرافراختہ، ہاں پردۂ تہِ ناز
اے مطربِ نوخاستہ اک لحنِ چغانہ

عشرت کدۂ جادوئے بابل ہیں لبِ لعل
آنکھیں تری حیرت کدۂ سحرِ مغانہ

اے گردشِ ایّام! خبردار خبردار
آساں نہیں کچھ نقشِ تمنّا کا مٹانا

عشق اور خرد میں جو تفاوت ہے تو یہ ہے
عشق ایک حقیقت ہے خرد ایک فسانہ

پھولوں سے بہاروں سے ستاروں سے گزر جا
ہے دور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانہ

کیا جانیے آزادؔ! مرا عشقِ جنوں خیز
جینے کا سہارا ہے کہ مرنے کا بہانہ

دو آتشہ

ابوسعید ابوالخیرؒ کی رُباعیات

دن گزرا غمِ جہانِ فرسودہ میں
اور شب ہوسِ بُودہ و نابودہ میں
القصّہ حیاتِ بیش قیمت ساری
گذری یونہی فکر ہائے بیہودہ میں

وصل اُس کا کہاں اور یہ مہجور کہاں
دُردانہ کہاں حوصلۂ مور کہاں
ہر چند کہ خوف مجھ کو جلنے سے نہیں
پروانہ کہاں اور آتشِ طور کہاں

شاعرِ مشرق علّامہ اقبال کے افکار

دُنیائے دِل

دُنیائے دِل میں دلکشئ رنگ و بُو نہیں
اِس میں بلند و پست نہیں کاخ و کُو نہیں
گردوں نہیں زمین نہیں چار سو نہیں
عالم یہ وُہ ہے جس میں جُز اللہ ہُو نہیں

(ارمغانِ حجاز)

نیند اور مَوت ✓

نیند کیا ہے ذرا سی دیر کی مَوت
مَوت کیا ہے تمام عمر کی نیند

(پیامِ مشرق)

رباعیات

دریں صحرا بہ ایں حالِ تباہے
نہ بیند چشمِ حیرانِ تو راہے
بیا با من حضورِ پیرِ مشرق
کہ از فیضانِ اُو یابی نگاہے

بگیر ایں نکتۂ روشن ز اقبال
کہ روشن تر ز مہر و ماہتاب است
"جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز
کہ اُو با صد تجلّی در حجاب است"

بمن گفت ایں بہ خلوت ساقیٔ من
ہنوز از گفتہ اش جاں در خروش است
"مئے من گرچہ ناصاف است و کرش
کہ ایں تہ جرعۂ جہاے دوش است"

○

چہ خوش گفتا فقیرے بے گلیمے
حضورِ گفتہ اش لعل و گہر چیست
"چو بر داں از دو گیتی بے نیاز اند
دگر سرمایۂ اہلِ ہنر چیست"

غزل

مری نگاہ کو سجدے کا حوصلہ ہی نہ تھا
اگرچہ میں بھی ترے آستاں سے گزرا ہوں

گماں کی راہ دکھائی ہے پھر یقیں نے مجھے
کبھی کبھی جو حدودِ گماں سے گزرا ہوں

کہیں مذاقِ نظر کو قرار مل نہ سکا
کبھی چمن سے کبھی کہکشاں سے گزرا ہوں

ترے قریب سے گزرا ہوں اس طرح کہ تجھے
خبر بھی ہو نہ سکی میں کہاں سے گزرا ہوں

دیارِ دوست سے گزرا تو ہوں مگر آزاد
عجیب بے خبری میں وہاں سے گزرا ہوں

○

اپنے جلووں کو مری حسرتِ نظر سے نہ چھپا
کہ صلہ چاہتی ہے میری پریشاں نظری

چاندنی اُتری پھلواری میں

باغ پہ کس نے جادو پھیرا   پھُولوں کو نیند آئی
ڈال ڈال پہ پات پات پر   مستی سی لہرائی

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مُسکائی

پھول پھول پر کلی کلی پر بھونرا آ کر گھومے
جاتے اُس کے من میں کیا ہے کلیوں کا مُنہ چومے

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مسکائی

اپنی دُھن میں گاتی تھی رس پینے کو آئی
پھلواری کے نام نہ جانے کیا سندیسہ لائی

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مسکائی

رات کی رانی دُور کہیں سے اپنا راگ سنائے
گھولتی جائے کانوں میں رس من میں بیٹھتی جائے

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مسکائی

بھولے من! آخر یہ نظارہ   کیوں تجھ کو تڑپائے
بھید کی باتیں پوچھنے والے   کون تجھے سمجھائے

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مُسکائی

غزل

شوق پابندِ فضائے چمنستاں نہ ہُوا
دِل مرا جورِ خزاں سے بھی پشیماں نہ ہُوا
صدمۂ ہجر سے دل جلوہ بداماں نہ ہُوا
چوٹ کھا کر بھی یہ پتھر شرر افشاں نہ ہُوا
آدمی ہو کے بھی دُنیا میں وہ انساں نہ ہُوا
ننگ و ناموسِ وطن کا جو نگہباں نہ ہُوا

تری منظروں میں علاجِ غمِ دوراں ہے مگر
ان سے اپنا تو علاجِ غمِ دوراں نہ ہُوا

فصلِ گل آئی بھی اور باغ سے رخصت بھی ہوئی
آہ وہ شوقِ فسردہ کہ غزل خواں نہ ہُوا

نہ ہوئی برق چمک کر بھی تبسّم کا جواب
پھول کھل کر بھی حریفِ رُخِ جاناں نہ ہُوا

میں نے چاہا تھا بہاروں میں سما جاؤں مگر
یہ نظارہ بھی مرے شوق کے شایاں نہ ہُوا

کنارِ راوی

ایک کیفِ سرمدی سا عالم پہ چھا رہا تھا
دُنیا کا ذرّہ ذرّہ مستی میں آ رہا تھا

ہر چیز چاندنی سے زرپوش ہو رہی تھی
گردوں سے ماہِ تاباں سونا لٹا رہا تھا

دو موسموں میں باہم تھا اتّصال گویا
اک وقت آ رہا تھا اک وقت جا رہا تھا

راوی کے پُل کے نیچے نغمہ بار لہریں
لہروں کا راگ دل کو بے خود بنا رہا تھا

موجوں سے ہلکے ہلکے گرداب پڑ رہے تھے
منظر یہ میرے دل میں طوفاں اٹھا رہا تھا

اس رات کی نہ پوچھو اس رات کا نظارہ
احساس بن کے میرے دل میں سما رہا تھا

پل بھر میں دل کی لیکن حالت ہوئی دگرگوں
اس منظرِ حسیں سے دل دور جا رہا تھا

اک انقلاب آیا ہر شے کی دلکشی میں
جو دلنشیں تھا منظر اب دل کو کھا رہا تھا

اب منظرِ حسیں پر جمتی نہ تھیں نگاہیں
کوئی دلِ حزیں کو پھر یاد آ رہا تھا

غزل

جیتا ہے غم سہتا ہے غم سہہ کر مر جاتا ہے

دل اور دل کی دنیا کا بس اتنا افسانہ ہے

پھولوں کے متوالو کیا باغ سے پیار بڑھانا ہے

شاخ پہ دو دن رہتا ہے گاتا ہے اُڑ جاتا ہے

محفل میں آنے والے پروانوں کا کھیل بھی دیکھ

دوست کی محفل میں آ کر اب واپس کیا جانا ہے

راہِ سفر کی دشواری اور منزل سے بیزاری
یہ تو روز کی باتیں ہیں ان سے کیا گھبرانا ہے

راہِ طلب دشوار سہی، یہ وادی پُرخار سہی
چلنا اک آزار سہی لیکن چلتے جانا ہے

عالمِ فانی میں اے دل! اُن کا تبسم دیکھ جنہیں
صبح کو شاخ پہ کھِلنا ہے شام کو مُرجھا جانا ہے

یہ آباد سا ویرانہ یہ ویران سی آبادی
دل بھی عجب آبادی ہے دل بھی عجب ویرانہ ہے

اِس میخانے میں اپنے شوقِ طلب کی بات نہ پُوچھ
روزِ ازل سے شوقِ طلب ایک نگوں پیمانہ ہے

پچھلی محفل شوق آزادین کی قبا سے روشن تھی
اب وہ شمعیں بجھ بھی گئیں اب واپس کیا جانا ہے

اُمید

تُند ہوئیں پُر کیف ہوائیں   گھِر کر چھائیں مست گھٹائیں
ہو گئیں ظُلمت پوش فضائیں
بزمِ جہاں کو آناً فاناً   تاریکی نے گھیر لیا ہے

دیکھ وہ چمکا ایک ستارا   روشن روشن پیارا پیارا
رُوح کی تسکیں حسن کا نظارا
مست گھٹاؤں سے بے پروا   ظلمت کے طوفاں میں کھڑا ہے

یہ تارا اِن طوفانوں میں   کہساروں میں، میدانوں میں
آبادی میں ویرانوں میں
عزم کی مشعل ہاتھ میں لے کر   اے دِل! تیرا راہ نما ہے

غزل

اس معمورۂ فانی میں گلزار ہیں یا ویرانے ہیں
یہ بھی ترے کاشانے ہیں اے دل وہ بھی ترے کاشانے ہیں

غم خانہ جنہیں احساس کہاں احساس سے یہ بیگانے ہیں
دیوانوں کی بات ہی کیا ہے دیوانے دیوانے ہیں

راتیں کتنی تاریک ہیں مانا صبح کی رنگین فضا
یہ بھی تری روداد ہے اے دل وہ بھی ترے افسانے ہیں

فرزانوں کو ڈھونڈ رہے ہو دنیا کے معموروں میں
یہ بیگانہ دیس ہے اے دل اپنے سب بیگانے ہیں

رات جنہوں نے محفل کو انداز سکھائے جینے کے
خاکستر کو دیکھنے والے! ہاں یہ وہی پروانے ہیں

انسانوں کو ڈھونڈنے والے ذوقِ نظر! با ہوش ہو
یہ آبادی یہ معمورے اصل میں سب ویرانے ہیں

شعر و سخن میں ناممکن اظہار ہے جن افسانوں کا
پلکوں پہ بنتا ہے قطرے وہ خاموش افسانے ہیں

منزل سے بھی ناواقف ہیں راہ سے بھی آگاہ نہیں
اپنی دھن میں پھر بھی رواں ہیں یہ بھی عجب دیوانے ہیں

یہ تنہائی یہ ویرانہ شام کی یہ غمناک فضا
تم کو جو سو بار سنائے ہاں یہ وہی افسانے ہیں

خاک پہ دھندلے نقش فضا میں مٹتی مٹتی آوازیں
ایک نظر آزاد! کہ یہ بھی چند جمیل افسانے ہیں

انڈیا گیٹ

انڈیا گیٹ کی رفعت ہے نگاہوں پہ محیط
انڈیا گیٹ وہ تاریخ کا اک باب نفیس
انڈیا گیٹ وہ افرنگ کی تعمیر جمیل
انڈیا گیٹ وہ اغیار کی نصرت کا نشان
انڈیا گیٹ وہ اپنوں کی غلامی کی دلیل

کشورِ ہند کے جانبازِ محبّانِ وطن
خون سے سینچے نکلے ہیں پرایوں کا چمن
ایک سیلاب شجاعت کا بڑھا آتا ہے
کہیں دھچکے کی ہیں لہریں کہیں امواجِ محن

واہ کیا جوش بھرا ہے نشۂ عشق
ہر قدم سے ہے عیاں حسرتِ شمشیر ترقی
جو کہ ہر شخص کو جانباز بنا دیتی ہے
اور افلاس رہِ منزلِ حبّ الوطنی!

دشت و کہسار پہ رکھتے ہیں کچھ اس طرح قدم
زیر و بم چال کا کھاتا ہے ارادوں کی قسم

ہند کی فوجِ ظفر موج جہاں جائے گی
گاڑ دے گی وہیں انگریز کی نصرت کا علَم

سامنے دیدۂ مشتاق کے موجود ہے کیا
زندگانی کے خزانے سے یہ مفقود ہے کیا
اوجِ افلاک کو تو پال گُشتا ہے لیکن
مرے اخلاص تری منزلِ مقصود ہے کیا
انڈیا گیٹ کی رفعت پہ نگاہوں پہ محیط

۱۹۴۴ء

غزل

امتحاں کی منزل تک تیرے شوق کے صدقے ہم رواں دواں پہنچے
ورنہ یہ وہ منزل ہے جس کو ڈھونڈنے والے کیا خبر کہاں پہنچے

گلستاں کو دیکھ آئی، کہکشاں سے ہو آئی، آسماں کو چھو آئی
اے نگارِ ناپیدا اب تری تمنّا میں آرزو کہاں پہنچے

ہنس کے دیکھنے والے، تیری بے وفائی کا غم جہاں پہ لے آیا
اس مقام پہ ہم کو اب نہیں گوارا یہ غم کو کچھ زیاں پہنچے

کاوشِ مسلسل کا کیا دیا صلہ مجھ کو تم سے کیا مِلا مجھ کو

میں تو یہ سمجھتا تھا زیست مُسکرا اُٹھّی تم جہاں جہاں پہنچے

دوست کے تجسّس میں ہم نکل گئے اکثر منزلوں سے بھی آگے

ساتھ چھوڑنے والو اب تمہیں بتائیں کیا ہم کہاں کہاں پہنچے

نکہتیں یہ کہتی ہیں لالہ زارِ اُردو میں پھر بہار پیدا ہے

حیف باغبانوں پر اس چمن میں اے آزادؔ اب اگر خزاں پہنچے

اُمیدِ موہوم

سنہ ۱۹۴۰ء

یہ سماں دیکھ کے زنداں میں ہے تو مستِ خرام
کہ مٹا چاہتا ہے بزمِ گلستاں کا نظام

اس کی بربادی پہ یوں شاد نہ ہو مرغِ قفس
کہ یہ ہنگامِ مسرت ہے نفس یا دو نفس

جن کے ہاتھوں سے ہے برباد گلستاں کی زمیں
وہ بھی تیرے لئے بیگانے ہیں اپنے تو نہیں

آ کے تاراج کریں گے جو گلستاں تیرا
تو سمجھتا ہے کہ توڑیں گے وہ زنداں تیرا

آہ اے مرغِ قفس خام خیالی پہ نہ پھول
وہ بھی اپنے نہیں اغیار ہیں اغیار نہ بھول

دیکھ حالات پہ پیغام لیے آتے ہیں
وہ بھی ہم رنگ ترے دام لیے آتے ہیں

گلستاں کے لئے وہ دھول لئے آتے ہیں
تیرے زنداں کے لئے پھول لئے آتے ہیں

جن کی نکہت سے ترے گھر کو وہ مہکائیں گے
جن کی رنگت سے ترے دل کو وہ بہلائیں گے

زندگانی کے حوادث سے ڈرائیں گے تجھے
تجھ کو بیدار جو پائیں گے سلائیں گے تجھے

گرمئ امید سے مایوس کریں گے تجھ کو

ترے زنداں ہی سے مانوس کریں گے تجھ کو

یوں دلآویز بنے گی ترے زنداں کی فضا

کہ نہ آئے گی تجھے یاد گلستاں کی ہوا

مٹ بھی جائے اگر آج اس چمنستاں کا نظام

پھر بھی تبدیل نہ ہوگا ترے زنداں کا نظام

کہ تہِ سقفِ فلک فطرتِ صیاد ہے ایک

شرق سے غرب تلک فطرتِ صیاد ہے ایک

یہ وہ شے ہے کہ بدلتی نہیں حالات کے ساتھ

غیر ممکن ہے اسے انس مساوات کے ساتھ

جب ہو دنیا میں خزاں اس کا چمن کھلتا ہے

اس کے بھپرے ہوئے جذبے کو سکوں ملتا ہے

ہاں تو ٹوٹنے جو لگا ہے چمنستاں کا نظام
اپنے زنداں میں نہ ہو مرغِ قفس مست خرام
کسی انصاف کی صیّاد سے اُمید نہ رکھ
کرم و رحم کی جلّاد سے اُمید نہ رکھ
خارزاروں سے اُمیدِ گلِ رنگیں ہے فضول
کبھی طوفاں سے بھی ہو سکتا ہے تسکیں کا حصول
متمنّی گہر و لعل کا ہے خاک سے کیوں
طالبِ رحم ہے تو گردشِ افلاک سے کیوں
کر نہیں سکتے ہیں افلاک مداوا تیرا
ہے تری ضربتِ بے باک مداوا تیرا

غزل

نغمے چمن کی خاک پہ برسا رہا ہوں میں

پھولوں کو درسِ شوق سے مہکا رہا ہوں میں

سانسوں کے ساتھ تجھ کو بلاتا رہا ہوں میں

خطرہ بہ خطرہ تیرے قریب آ رہا ہوں میں

کوئی یہ میرے ہمسفروں کو پیام دے

بڑھ کر دیارِ منتظراں کو آ رہا ہوں میں

اب محفلِ فنا بھی نگاہوں سے چھپ گئی
کتنی بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر
دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

اِک بے وفا کی نذر کروں پھر وقارِ عشق
کیا آرزو ہے جس پہ مٹا جا رہا ہوں میں

آزاد کوئی مجھ سے یہ پُوچھے تو کیا کہوں
وابستہ کیوں فریبِ وفا کھا رہا ہوں میں

بورڈ آف انٹرویو

دفتر کے اندر چند ایک افسر
ذوقِ نظر سے بے بہرہ یکسر
بیٹھے ہُوئے ہیں رزّاق بن کر
دَورِ سحر میں
شب رنگ منظر

باہر جواں ہیں خوش فکر و خوش پوش
بیٹھے ہیں سارے چُپ چاپ خاموش
علمی بلندی پستی سے ہمدوش
آرام فردا!
آسائشِ دوش
چہروں سے ظاہر افکارِ عالی
جادو بیانی شیریں مقالی
آئی ہوئی ہے بن کر سوالی
اے ہند تیرا
اللہ والی!

اشعار

کہاں کہاں نہ ترا شوق لے گیا دل کو
کہاں کہاں نہ تری جستجو نے خوار کیا

بھلا ہوا کہ میسر تو آئی مایوسی
بُرا کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

نہ اب وہ رات کے نالے نہ فریادِ سحرگاہی
مداوا بن گیا خود دردِ پیہم دردِ پیہم کا

○

غمِ دوراں کی ہوائیں تھیں بہت تیز مگر
ترا شعلۂ غمِ جاناں کبھی مدھم نہ ہوا

○

بڑی مدت رہا مصروفِ سعیِ لب کشائی میں
بڑی مشکل سے میرے لب پہ حرفِ ناتمام آیا

○

تری نگاہِ پُرآشوب پر نہیں موقوف
مرا سفینۂ دل ہے ازل سے طوفانی

ترے وصل میں کہاں تھا یہ سرورِ تشنہ کامی
مرے کام آئی آخر مری آرزو کی خامی

○

بہ کامم بادۂ ذوقِ جدائی خوشگوار آمد
غمِ فرقت بہ جانِ بے قرارم سازگار آمد

○

خدا کرے کہ مسلسل اک اضطراب رہے
خدا کرے کہ میسر نہ ہو وصال ترا

○

بس اتنا جانتا ہوں کوئی ہمسفر نہیں
یہ کیا مقام ہے مجھے اتنی خبر نہیں

میرے شوقِ بندگی کو حسرتِ یک سجدہ ہے
تجھ کو اے عمرِ گریزاں فرصتِ یک سجدہ ہے؟

○

ہزار نور سے لبریز ہو ستارہ ترا
جو آندھیوں میں درخشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
صدف ہے آنکھ تو آنسو ہے قطرۂ نیساں
صدف میں قطرۂ نیساں نہیں تو کچھ بھی نہیں
چمن سے دور بھی ہو عندلیب بال کشا
مگر اسیرِ گلستاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

○

کچھ دید کے قابل ہے جہاں میں تو یہی ہے
اے دیدۂ دِل بے رخیٔ اہلِ جہاں دیکھ

کلکتہ

۱۹۴۶ء

کلکتہ ہُوا آگ کے شعلوں میں گرفتار
دیکھ اے دلِ آزاد قیامت کا نظارا
لے آئی ہے تہذیب کہاں فکر و نظر کو
اِنساں کو نہیں ہستیٔ انساں بھی گوارا

وہ آگ کے شعلوں میں تڑپتے ہوئے انساں
وہ خون کے دریاؤں میں بہتے ہوئے لاشے
دنیا ہے انہیں دیکھ کے انگشت بدنداں
اے اہلِ وطن تم نے دکھائے جو تماشے

یہ قہر خدا کا ہے نہ غصہ ہے قضا کا
یہ آگ خود انسان کی بھڑکائی ہوئی ہے
یہ ظلم، یہ بیداد، یہ لعنت، یہ تباہی
انسان کی انسان پہ خود لائی ہوئی ہے

انسان کا انسان پہ یہ ظلم یہ بیداد
یہ جنگ نہیں جنگ سے کچھ بڑھ کے سماں ہے
ہے عزم کہ اک شہر خموشاں میں بدل جائے
یہ سوچ ہے کہ محشر کدۂ آہ و فغاں ہے

اس آفتِ جانکاہ سے مصئوں نہیں کوئی
بچے بھی گرفتار ہیں بوڑھے بھی گرفتار
عالم وہ ہے محفوظ نہ عزت ہے نہ جاں ہے
کوئی نہ محافظ نہ مددگار نہ غمخوار

یہ آتش و آہن کی حکومت کا زمانہ
ہر دل ہے پریشان قیامت ہے قیامت
انساں کا لہو اور ہو پانی سے بھی ارزاں
اب دھل نہ سکے گا یہ کبھی داغِ ندامت

اک راز ہے اک راز نئے دور کی تہذیب
آزاد کوئی فاش کرے مجھ پہ خدا را
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ سیاست
مرنے کا بہانہ ہے کہ جینے کا سہارا

کسان

اے فرض سے بیگانی دُنیا میں اپنے فرض کے دیوانے
اے کام پہ جاں دینے والے! آرام و سکوں سے بیگانے
دیہات میں رہ کر شہروں کے گلزار کو مہکانے والے
ہر اک کو نعمت دے دے کر خود نانِ جویں کھانے والے
یہ پھل ہے تیری کمائی کا رونق ہے جو بازاروں میں
ہے تیری جنسِ وفا پنہاں اجناس کے ان انباروں میں

سلطاں بھی ہے دست نگر تیرا درویش بھی ہے محتاج ترا

افسوس تو یہ ہے کوئی بھی ممنون نہیں ہے آج ترا

محنت سے تو ہی عشرت رہتی ہے اقصاں عشرت گاہوں میں

راتیں تیری کٹتی ہیں مگر کچھ نالوں میں کچھ آہوں میں

سورج کے نکلنے سے پہلے کھیتوں میں پہنچ جانے والے

اور رات کو چھاؤں میں تاروں کی اے لوٹ کے گھر آنے والے

اب خوابِ گراں سے جاگ کہ ہیں تیرے بھی دن پھرنے والے

رنگین جو تیرے خوں سے ہوئے اب ہیں وہ محل گرنے والے

سوامی رام تیرتھ

عجب شے ہے خاکِ پنجاب بھی
کہ ہے جسم بھی ہے اور بیتاب بھی
بجا ہے اگر اس کو مردہ کہیں
فضول اس کو بے جان و مردود کہیں
مگر تشنہ اُٹھا وُہ یہیں سے اُٹھا
اِسی خاکِ ظلمت قریں سے اُٹھا

تعصب کا اس پر پڑا ہے حجاب
وطن کی ترقی میں ہے سدِّ باب

یہ پہلو ہے ایک اس کی تصویر کا
بہت خوش نما ہے مگر دوسرا

یہ پستی کا پہلو بلندی کا وہ
یہ خفت کا اور ارجمندی کا وہ

اسی دوسرے سے یہ تابندہ ہے
جہاں میں محبت رہے ارزندہ ہے

کئے اس نے پیدا وہ صاحب کمال
نہیں جن کی دنیا میں پیدا مثال

انہیں میں سے اک رام تیرتھ ہوا
ملی جس کو بزمِ فنا میں بقا

وہ عارف وہ درویشِ روشن رواں
وہ آزادِ بندِ زماں و مکاں
اسی خاک سے آشکارا ہُوا
اسی آسماں کا ستارا ہُوا
وہ موتی تھا اُس پر کرن جب پڑی
تو اس میں چمک اس قدر آگئی
کہ یکسر کرن بن گیا وُہ گہر
نہ تھا جس پہ مٹی کا کچھ بھی اثر
رہائیں زمانے کے گرداب میں
کنول جس طرح عالمِ آب میں
الگ ہو رہے اوجھل ہُوا اس طرح
سمندر میں جُوئے رواں جس طرح

زمانے کی منزل سے اُس کا سفر
نسیمِ سحر سے بھی تھا خُوب تر
شرارہ تھا انوار میں کھو گیا
وُہ قطرہ تھا دریا میں گم ہو گیا

اشعار

نو بہاروں کو چمن میں فرصتِ یک لحظہ ہے
اے تمنّا نو بہاروں سے کوئی پیماں نہ کر
یہ فریبِ رنگ و بو کچھ دیر رہنا چاہیئے
ورنہ توہینِ مذاقِ دید کا ساماں نہ کر
اپنے ہر عقدے کو اے آزادِ لاینحل بنا
مُشکلوں کا ساتھ دیتا جا انہیں آساں نہ کر

غزل

جلوے ہزار ذوقِ نمائش سے کام لیں
خود داریٔ جنوں کا تقاضا ہی اور ہے

اے حُسنِ بے نیاز! نہ کر دلبری پہ ناز
ٹوٹے ہُوئے دِلوں کی تمنّا ہی اور ہے

واقف ہے جن کی آنکھ مآلِ بہار سے
اُن کے لئے چمن کا تماشا ہی اور ہے

ذوقِ جنوں خرد پہ کرے التفات کیا

منزل ہی اس کی اور ہے رستہ ہی اور ہے

دُنیا ہے جن کے فیض سے اک جنّتِ نگاہ

اُن کی نظر ہی اور ہے دُنیا ہی اور ہے

○

جو نہیں بہار نصیب میں تو مجھے کچھ اِس کا الم نہیں

کہ تری خزاں کا فریب بھی تری نو بہار سے کم نہیں

نہ فریب دے مجھے دَیر کا نہ مجھے طلسمِ حرم دِکھا

میں پرے ہوں دیر و حرم سے اب مجھے شوقِ دیر و حرم نہیں

تاجورنجیب آبادی

اعزاز دیا تجھ کو جو شمس العلماء کا
سرکار نے سمجھا کہ بڑھائی تری توقیر
عمّالِ حکومت سے یہ ہرگز نہیں پنہاں
توصیف کی محتاج نہیں ہے تری تحریر
عالم پہ ہویدا ہے ترے شعر کی رفعت
دُنیا میں نمایاں ہے تری نثر کی تاثیر

تیری نگہِ فیض سے پیدا ہوئی اکثر
پتھّر میں چمک خاک میں خاصیتِ اکسیر
ہر دل ہے تری جدّتِ افکار کا قائل
ہر آنکھ پہ روشن ہے ترے فکر کی تنویر
جبریل ترے دامِ تفکّر میں گرفتار
پروازِ تخیّل ہے تری راست تراز تیر
ہوں فاخر و بیدار جس اُستاد کے شاگرد
نغمات میں ہے جن کے نہاں سحر کی تاثیر
کیا اُس کی فضیلت کو بڑھائیں گے خطابات
بڑھتی ہے کہیں شمع سے مہتاب کی تنویر
فاخر کے ترانے نہیں محتاجِ گلستاں
نالے نہیں بیدار کے پابندِ بم و زیر

بیدار کے نغموں سے ہے گلشن کی فضا گرم
اس کی نگہ تیز ہے تاروں سے بغلگیر

بیدار ہے وہ واقفِ اسرارِ معانی
جو شعر ہے اس کا وہ حقائق کی ہے تصویر

بیدار کے اشعار میں وہ بات ہے پنہاں
جو زہر کو تریاق کرے خاک کو اکسیر

سرکار نے پہنایا جو یہ ملکِ سخن کو
کیا سوچ کے بخشا ہے یہ اعزاز "یہ توقیر"

یہ عقدۂ سربستہ تھا ادراک کے آگے
حل کر نہ سکا جس کو مرا ناخنِ تدبیر

اس فکر میں میرا دلِ آزاد تھا پابند
ادراک کی پرواز تھی پابستۂ زنجیر

اک دوست نے اس راز کو افشا کیا آخر
پل بھر میں کھُلی مجھ پہ مری فہم کی تقصیر
اعزاز وکالت دیا ہے یہ جنہوں نے
شمس العلماءؒ کی انہیں مقصود تھی توقیر

اشعار

مانندِ لالۂ بہ خیاباں دمیدہ باش
یا مثلِ تیغِ تیز بہ میداں کشیدہ باش
یا مثلِ آہِ سینۂ سوزاں بلند شو
یا ہمچو اشکِ جانِ حزینے چکیدہ باش
بُلبل مثالِ دردِ دلِ من نشیں بہ گل
یا از چمن چو رنگِ رُخِ من پریدہ باش

اشعار

اب کے تو رنگ و بُو کا تماشا ہی اور ہے
یُوں اپنا شوق سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی
پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے میں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی
وُہ دن بھی تھے کہ شوق کی دُنیا تھی اور ہم
شیرازۂ خیال پریشاں نہ تھا کبھی

انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل
اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

○

خوابیدہ مری روح میں اے نغمۂ خاموش
تو دیکھ کہ میں گوشِ برآواز ہوں کب سے
تاروں کے دریچوں سے مجھے جھانکنے والے
تھامے ہوئے میں دل میں ترا راز ہوں کب سے

○

• مرا نصیب کہ منزل کو پاؤں اُٹھ نہ سکے
دیارِ دوست کے نزدیک جا کے لوٹ آیا
• نہ پوچھ میرے دلِ مضطرب پہ کیا گزری
تری نظر سے نظر جب ملا کے لوٹ آیا

خزاں کے تند بگولے چمن میں آ ہی گئے
کلی کے دل میں تمنا تھی مسکرانے کی

○

• نظر میں کیفیتِ درد و یاس رہتی ہے
ترے بغیر طبیعت اداس رہتی ہے
• خبر نہیں ہے تمنا کا یہ مقام ہے کیا
کہ تجھ سے ملنے کی ہر لحظہ آس رہتی ہے

○

وقت ہے صبا رفتار اس کے ساتھ کیا چلنا
تم ذرا ٹھہر جاؤ وقت کو گزرنے دو
منتظر جو رستے میں موت ہے تو پھر کیا ہے
اس میں حرج ہی کیا ہے زیست کو سنورنے دو

ہے یاد مجھے دورِ حسینوں کی تو بس اتنی
عالم تھا مرے دل پہ مگر بے خبری کا

○

پردے دل و نگاہ پہ ہیں حُسن پر نہیں
اپنے دِل و نگاہ سے پردے اُٹھا کے دیکھ

○

کارواں سے اِس طرح بچھڑے کہ تا حدِّ نظر
اب کہیں ہم کو نشانِ کارواں مِلتا نہیں

شملہ

ریل گاڑی رک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے
ساغرِ لبریز آنکھوں کا چھلک جانے کو ہے

سلسلہ نا ناوتی کا ہے نظر کے سامنے
پھر وُہی تصویر کھینچی ہے سکوتِ شام نے

دیکھ لے اک بار پھر اسے دیدۂ خوننابہ بار
سامنے ہے زندگی کی آرزوؤں کا مزار

کیا خبر کس کیفیت میں گم ہُوا جاتا ہوں میں
ایک طوفاں ہے کہ جس میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

خامشی سے نالہ کش ہے خاطرِ اندوہ گیں
روح میں دھڑکن سی ہے جذبات پر قابو نہیں
نطق کو حاصل کہاں تابِ بیانِ زندگی
بہہ گئے آنسو چھلک کر داستانِ زندگی

اے پہاڑو اے گھٹاؤ! مجھ کو شکوہ تم سے ہے
اے سکوں پرور ہواؤ مجھ کو شکوہ تم سے ہے
اے کسولی کے دلآرا کوہسارو کیا کیا
بادلوں کے اے جنوں پرور نظارو! کیا کیا
ہر طرف اُتری ہوئی دلکش بہارو! کیا کیا
جنّتِ چشمِ تماشا سبزہ زارو! کیا کیا
تم نے مل جل کر کسی کی نوجوانی چھین لی
ایک بیکس کی بہارِ زندگانی چھین لی

میری راحت اور میری شادمانی لوٹ لی
لُوٹ لی میری متاعِ زندگانی لوٹ لی

چیل کے اسے خوشنما اونچے درختو! دیکھ لو
دُور تک پھیلے ہُوئے پھولوں کے تختو! دیکھ لو

میں نے سمجھایا ہے تمہاری دلربائی کا فریب
رنگ و بُو کا، تازگی کا، جانفزائی کا فریب

میں تو سمجھا تھا کہ مجھ پہ رحم فرماؤ گے تم
اک فقیرِ بے نوا کو فیض پہنچاؤ گے تم

میں تو سمجھا تھا جسے لے کر یہاں آیا ہُوں میں
موت کی یورش سے اب اُس کو چھڑا لایا ہُوں میں

میں تو سمجھا تھا یہاں آ کر وُہ راحت پائے گی
اور اُس کو یہ فضائے دل نشیں راس آئے گی

میں تو سمجھا تھا مقدّر یاوری فرمائے گا

میری اُمیدوں کا سرمایہ نہ لٹنے پائے گا

کیا خبر بختی کامرانی آرزو سے دُور ہے

اور میری خوش نصیبی تم کو نامنظور ہے

اے درختو! میں تو سمجھا تھا کہ تم جھومو گے جب

ایک مرجھائی ہوئی پتّی کا مُنہ چُومو گے جب

وہ تمہارے لمس سے اک شادمانی پائے گی

شادمانی سے سرورِ زندگانی پائے گی

جب تمہارے سائے میں آرام فرمائے گی وہ

زندگانی کی نویدِ جانفزا پائے گی وہ

مجھ کو کیا معلوم تھا تم درد سے بیگانہ ہو

اپنی ہی دُنیا میں ہو گُم درد سے بیگانہ ہو

کیا خبر تھی تم پہ آہوں کا اثر ہوتا نہیں
اور غم دیدہ نگاہوں کا اثر ہوتا نہیں
چند گھڑیوں کے لئے جس پر تمہارا سایہ تھا
ہاں کسی برگشتہ قسمت کا وہی سرمایہ تھا
میں رفیقِ زندگی کو اس جگہ لایا تھا جب
اک مجسّم درد کی صورت یہاں آیا تھا جب
جب مری ہر سانس اک ٹوٹی ہوئی فریاد تھی
جب گرفتارِ مصائب فطرتِ آزاد تھی
رُوبرو آنکھوں کے جب اُمید بھی تھی یاس بھی
کارفرما نااُمیدی بھی تھی اور تھی آس بھی
ہمتیں باقی تھیں اپنے حوصلے ٹوٹے نہ تھے
آبلے تھے پاؤں میں لیکن ابھی پھوٹے نہ تھے

التجا کی تھی کہ اے نیتا وتی کے کوہسار

ملتجی ہوں میں ترے آگے بچشمِ اشکبار

جانفزا موسم سے یوں ارشاد فرما دے ذرا

اک مریضِ خستہ جاں کو فیض پہنچا دے ذرا

تو نے میری التجاؤں کی ذرا پروا نہ کی

درد میں ڈوبی دعاؤں کی ذرا پروا نہ کی

میرے آنسو پتھروں پر رائیگاں گرتے رہے

بن کے پیہم داستاں درد داستاں گرتے رہے

میں اُسے لے کر خدا جانے کہاں پھرتا رہا

پتھروں پر ڈگمگاتا جابجا گرتا رہا

مجھ کو ہر تکلیف میں ہر رنج میں آرام تھا

دل میں دردِ دوست تھا لب پر خدا کا نام تھا

کون کر سکتا ہے لیکن اے اجل! تیرا علاج
جب نہ منظورِ مقدّر ہو تو پھر کیسا علاج
چاند تارو! یہ سماں کتنا الم آثار تھا
میری قسمت سو رہی تھی اور میں بیدار تھا
اے گرفتارِ تپِ کہنہ! قرارِ چشم و دل
ایک مدّت تک رہی ہے تو علیل و مضمحل
ایک مدّت تک تجھے درد و الم سہنا پڑا
دُور گھر سے ہسپتالوں میں تجھے رہنا پڑا
تجھ کو ہر بدذائقہ کڑوی دوا پینی پڑی
مدّتوں پینی پڑی بے مدّعا پینی پڑی
پھیپھڑے پر وُہ ترے جرّاح کے نشتر کی ضرب
یاد سے اس کی مرے احساس میں ہے درد و کرب

شکر ہے آخر حوادث کا یہ بادل چھٹ گیا
شکر ہے آخر ترا دورِ مصائب کٹ گیا

سامنے میرے دعاؤں کا مری انجام ہے
اب ترے ہر درد ہر تکلیف کو آرام ہے

اب نہ روئے گی تو اپنی بچیوں کو دیکھ کر
اور اُس معصوم کی خاطر نہ ترسے گی نظر

جو ترے دامن میں آیا مسکرایا، چل بسا
جس کو یہ اندازِ دُنیا کا نہ بھایا، چل بسا

اب نہ ہم کڑوے دوا دارو پلائیں گے تجھے
اب نہ بیماروں کے بستر پر سُلائیں گے تجھے

اے کہ گھبراتی تھی تو کڑوی دوا کے نام سے
آگ کے شعلوں میں جا سوئی ہے کس آرام سے

آسماں تک شعلے پہنچے اور تُو نے اُف نہ کی
کس قدر حیران کن ہے ارتقائے زندگی

عالمِ فردوس میں تو آج آرامیدہ ہے
میرے سینے میں تری یادِ حسیں خوابیدہ ہے

روح باقی جا چکی ہے جسمِ فانی جل چکا
آج وہ میرا جہانِ شادمانی جل چکا

ہائے کیا نقشہ دکھایا گردشِ ایّام نے
تو نہیں ہے اور ہیں تیرے پھول میرے سامنے

چن کے تیری راکھ سے یہ پھول لے آیا ہوں میں
گوہرِ اشکِ رواں دے کر انھیں لایا ہوں میں

بزمِ فانی کی کثافت سے نہ آلودہ رہیں
پھول تیرے دامنِ گنگا میں آسودہ رہیں

ایک آرزو

اے شریکِ رنج و راحت! زندگانی کی رفیق

چارہ سازِ درد، میری شادمانی کی رفیق

میری آنکھوں کو ابھی تک وہ سماں بھولا نہیں

جب گرفتارِ گلو تھی تیری آوازِ حزیں

جب تری گفتار اک بھولا ہوا افسانہ تھا

ساز تھا لیکن حسیں آواز سے بیگانہ تھا

جب تری نبضیں مری اُنگلی تلے آتی نہ تھیں
جب تری سانسیں تری دُنیا کو گرماتی نہ تھیں

آسمانوں تک دعائیں میری جا سکتی نہ تھیں
تختِ اعظم کا کوئی پایہ ہلا سکتی نہ تھیں

نطق کی محتاج تھی جب میری فریادِ خموش
سوچنے کا عقل کو دل کو نہ تھا رونے کا ہوش

نیم شب کو جب اجل تیرے سرہانے آ گئی
جسم ٹھنڈا ہو گیا تیرا، نظر پتھرا گئی

دیکھتے ہی دیکھتے جب ہو گئی خاموش تو
میں نے دیکھا پھول باقی ہے مگر بے رنگ و بو

آج شاید تو مکان و لامکاں سے دور ہے
اس زمیں سے دور ہے اِس آسماں سے دور ہے

چاند تاروں سے پرے ہے کہکشاں سے دور ہے

عقل سے ادراک سے وہم و گماں سے دور ہے

حلقۂ روز و شب و شام و سحر سے دور ہے

تُو جہاں بھی ہے مری حدِ نظر سے دور ہے

کیا خبر مسکن ہے تیرا آج کل کس دیس میں

کون سے خوابوں کی دنیا میں، کیسے بھیس میں

کیا خبر اُس دیس کا کیا حال ہے کیا رنگ ہے

رہنے سہنے بات کرنے کا وہاں کیا ڈھنگ ہے

کاش مجھ کو تیری دنیا کا پتہ دیتا کوئی

تُو کہاں ہے مجھ کو اِتنا ہی بتا دیتا کوئی

میں تو اتنا جانتا ہوں اے قرارِ چشم و دل

اے مری حدِ نظر! اے انتظارِ چشم و دل

جب چتا کی لکڑیوں پر سو گیا تیرا شباب

"کچھ نظر آیا نہ جز یک شعلۂ پر پیچ و تاب

شمع تک ہی میں نے یہ دیکھا کہ پروانہ گیا"°

دُور تک گو جستجو میں شوقِ دیوانہ گیا

تو کہاں ہے اے مرے گلزارِ ہستی کی بہار

قسمتِ بیدار، پروردِ نہاں کی چارہ کار

کیا صبا بن کر کسی گلشن میں آوارہ ہے تُو

یا بسیرا کر لیا پھولوں کے دِل میں مثلِ بُو

یا فلک پر ہے کسی تارے کی تابانی میں گُم؟

یا مرے افکارِ روشن کی درخشانی میں گم

مائلِ آرام تو مہتاب کے ایواں میں ہے؟

یا کہیں آسودہ میرے خاطرِ ویراں میں ہے؟

° میر کے شعر میں ہلکا سا تصرّف کیا گیا ہے

تیرے دل کو بھا گئی ہے کوئی خوابوں کی زمیں
یا پسند آئی ہے آوارہ سحابوں کی زمیں
ہوگئی تو آبشاروں کے ترنّم میں مکیں؛
یا ٹھکانا کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں؛
جس کو تو محبوب تھی تو اُس فضا میں تو نہیں؛
تو پہاڑوں کی چٹانوں پر در رہوا میں تو نہیں
دُور اُفق کی منزلوں سے بھی کہیں تیرا ہے گھر؛
یا ہے تو خورشید کی پہلی کرن میں جلوہ گر
دیدۂ آہو میں ہے تو، یا رمِ آہو میں ہے؛
کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے
برگِ گل پر قطرۂ شبنم کی بیتابی میں ہے؛
یا مرے سوکھے ہوئے آنسو کی نایابی میں ہے؟

آبِ گوہر میں ہے دریا کی روانی میں ہے تُو
یا مرے ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی میں ہے تُو

تتلیوں کے خوش نما رنگوں میں آرامیدہ ہے
وقت کی پرواز کے دامن میں یا خوابیدہ ہے

جنّتِ گم گشتہ! پوشیدہ ترا از کیفِ بہار!
جستجو میں تھک گئی ہے میری چشمِ انتظار

اے کہ تجھ کو ڈھونڈتی ہے میری جانِ دردمند
اے کہ اک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھ کو پسند

ہو سکے تو میری خلوت گاہ میں پھر آ کبھی
خاطرِ اندوہگیں کو شادماں فرما کبھی

فریبِ منظر

سمجھ میں آ نہ سکا یہ طلسمِ مرگ و حیات
ہمیشہ راز رہا عقل پر فنا و ثبات
خرد اگرچہ رہی اس کی جستجو میں مدام
مگر نہ کھول سکی عقدۂ حیات و ممات

طواف کر کے نگاہِ عمیق لوٹ آئی

عجیب گنبدِ بے در ہے جلوہ گاہِ صفات

فریب ہے کہ حقیقت حیات کیا شے ہے

کھلا نہ رازِ فنا کیا ثبات کیا شے ہے

فضا نے رنگ جو بدلا تو نو بہار آئی

نسیمِ صبح چمن زار کو نکھار آئی

ہر ایک کنجِ دل آویز میں ہوائے بہار

ہر ایک پتی کو ہر پھول کو سنوار آئی

فلک پہ ابر جو اٹھا تو کیف بار اٹھا

صبا چمن میں جو آئی تو عطر بار آئی

کہ آ کے تند بگولوں نے یہ سماں بدلا

فضا میں خاک اڑی رنگِ آسماں بدلا

خبر نہیں ترے جانے کا مدّعا کیا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ ماجرا کیا ہے
مجھے کچھ اپنی خطا کا پتہ نہیں چلتا
سزا جو مجھ کو ملی ہے مری خطا کیا ہے
خیال اپنی امنگوں پہ بیکراں تھا مگر
خبر نہ تھی کہ امنگوں کی انتہا کیا ہے
مئے نشاط کا ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا
کھلی جو آنکھ تو سارا طلسم ٹوٹ گیا
کسی بھی گل کا تبسّم نہیں بقا کے لئے
ہر ایک ذرّۂ ناچیز ہے فنا کے لئے
دل و نظر کی پریشانیوں کا حال نہ پوچھ
کہ اب تو ہاتھ بھی اُٹھتے نہیں دُعا کے لئے

ذرا بھی ہے جو تجھے میری آرزو کا خیال

تو ایک بار نظر آ مجھے خدا کے لئے

تو جس فضا میں بھی ہے اُس فضا کو چھوڑ کے آ

طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ توڑ کے آ

تجھے خبر بھی ہے تجھ کو بُلا رہا [illegible]

رہینِ خوابِ فنا کو جگا رہا ہے کوئی

کبھی بہ نطق و تکلم، کبھی خموشی سے

فسانۂ غمِ ہستی سُنا رہا ہے کوئی

قدم قدم پہ یہ احساس ہے کہ تنہا ہوں

قدم قدم پہ مجھے یاد آ رہا ہے کوئی

"رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست"

استفسار

دیدہ و دل کی مکیں میری تمنائے نشاط
آرزو کی منزلِ مقصود دنیائے نشاط

سال تجھ کو ہو گیا دنیا سے منہ موڑے ہوئے
مجھ سے اپنا رشتۂ مہر و وفا توڑے ہوئے

دل نے اب تک اپنے دامن میں بسایا ہے تجھے
درد نے خاموش نالوں سے بلایا ہے تجھے

اے کہ ہے احساس کی گہرائی میں تیرا مقام
آج پھر جذبات کی دُنیا ہے تجھ سے ہمکلام

گرچہ مبہم ہے مگر پھر بھی یہ حرفِ راز سُن
تو جہاں بھی جس طرح بھی ہے مری آواز سُن

جب فریبِ رنگ و بُو سے تو جُدا ہو کر چلی
اس جہانِ زندگانی سے خفا ہو کر چلی

خارزاروں سے ہُوا یا لالہ زاروں سے گذر
تھا خزاں سے یا ترا رنگیں بہاروں سے گذر

کیا نئی دُنیا نئے انساں تھے تیرے منتظر
دل کشی کے کیا نئے ساماں تھے تیرے منتظر

یا جہاں پہنچی وہاں تیرے سوا کچھ بھی نہ تھا
تیری دنیا میں بجز نامِ خدا کچھ بھی نہ تھا

آگ کی منزل پہ تو میں خود تجھے پہنچا گیا
اس کے آگے کچھ نہ دیکھا میں نے شعلوں کے سوا

اے کہ تیری یاد میں ہے دل کی دُنیا سوگوار
پُوچھنا یہ چاہتا ہے میرا شوقِ بے قرار

آگ کے شعلوں سے جب گذری تو کیا درپیش تھا
رُو برو تیرے کوئی بیگانہ تھا یا خویش تھا

کیا تجھے کچھ درد یا تکلیف کا احساس تھا؛
کچھ تجھے معلوم بھی ہے کون تیرے پاس تھا؛

تو کہاں ہے اے مرے خاموش نالوں کی مکیں
ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھ کو میری دُنیائے حزیں

آج بھی تیرا تصور رُوح کی دُنیا میں ہے
یہ نہیں کھلتا کہ تو خود کون سی دُنیا میں ہے

تو ہے جس دنیا میں وہ بھی اس طرح دنیا ہے کیا
یعنی انساں کی وہاں بھی آرزو رسوا ہے کیا

مرنے والی! وہ جہاں بھی ہے جہانِ سنگ و خشت
کیا وہاں بھی زندگانی ہے اسیرِ خوب و زشت

کیا وہاں بھی ہے ستاروں کی گردش میں اسیر؟
یا ہے کوکب زندگانی کا ازل سے مستنیر؟

وہ بھی کیا اس کی طرح ہے اک جہانِ خیر و شر؟
یا وہاں کی زندگی ہے خیر و شر سے بے خبر

کیا وہاں بھی زندگی کا ہے یہی انجام موت
پھینک دیتی ہے وہاں بھی ہر خوشی پر دام موت؟

لالہ زاروں کی اور صیادوں کی دنیا وہ بھی ہے؟
شور چیخوں اور فریادوں کی دنیا وہ بھی ہے؟

کیا بشر اُس دیس میں بھی بیکس و مجبور ہے؟

کیا وہاں بھی زندگانی کا یہی دستور ہے؟

کیا وہاں بھی رُوحِ انساں درد سے آباد ہے

فکرِ انساں پا بہ گِل ہے زندگی ناشاد ہے؟

کیا وہاں بھی نالہ و فریاد سے کہرام ہے

کیا وہاں بھی آدمی ناکام ہی ناکام ہے؟

کیا وہاں بھی زور ہے تدبیر پر تقدیر کا

وہ جہاں بھی ہے یونہی پابند اسی زنجیر کا؟

ولولے اُس دیس میں بھی کیا شکست انجام ہیں

واں بھی کیا طائر امنگوں کے اسیرِ دام ہیں

کیا وہاں بھی ہے عزیز و اقربا کا درد و غم

کیا وہاں بھی بے نیازِ صبح ہے شامِ الم؟

یا وہاں کچھ زندگی کا اور ہی دستور ہے
اور اس دنیا کی جو تلخی ہے نامنظور ہے
کیا وہاں راحت ہی راحت کے سوا کچھ بھی نہیں
نغمۂ عیش و مسرّت کے سوا کچھ بھی نہیں؟
زندگی کی دوپہر پر موت کا سایہ نہیں
سرخوشی کو اپنے مٹنے کا خیال آیا نہیں؟
ہر طرف لہرا رہی ہے ایک موجِ انبساط
صبح صبحِ عیش ہے ہر شام ہے شامِ نشاط؟
کیا وہاں انسان درد و رنج سے بیگانہ ہے
بے خبر شامِ الم سے صبح کا افسانہ ہے؟
کیا وہاں دردِ تمنّا روح میں چبھتا نہیں
فکرِ انسانی وہاں ہوتا نہیں اندوہگیں؟

کیا وہاں اُٹھتی نہیں ہے گریۂ غم کی صدا
کیا وہاں پیدا نہیں ہوتی ہے ماتم کی صدا؟
کیا وہاں کے لالہ زاروں پر خزاں آتی نہیں
پتے پتے پر وہ اپنا جال پھیلاتی نہیں؟
کیا وہاں ناکامیوں سے آشنا دُنیا نہیں
عقل و دل کی خامیوں سے آشنا دنیا نہیں؟
دام کیا باغوں میں ہمرنگِ زمیں ہوتے نہیں
کیا شکاری گوشے گوشے میں کمیں ہوتے نہیں؟
کیا وہاں ہر طائرِ رنگیں نوا آزاد ہے
بے نیازِ دام ہے ہر طرح سے دل شاد ہے
کیا وہاں دام و قفس کی زندگی ناپید ہے
کیا وہاں اس طرح کی شرمندگی ناپید ہے

کیا مقدّر ہے بشر کا مستی و کیف و نشاط
جلوہ گر اس دیس میں ہے کیا سرور و انبساط؟
کیا کروں میں راز یہ ادراک پر کھلتا نہیں
سرِّ افلاک ہے شاید خاک پر کھلتا نہیں
میں تو اس دنیا میں ہوں دنیا کی ظلمت میں اسیر
ایک تیری یاد کا کوکب ہے دل میں مستنیر
تو خدا جانے کہاں ہے اور کس عالم میں ہے
میں ہوں جس دنیا میں لیکن وہ سراپا غم میں ہے
یادگاریں تو نے چھوڑی ہیں جو دو میرے لئے
گرچہ قندیلیں ہیں دو وہ میری دنیا کے لئے
یہ بتا میں اُن کو لیکن مطمئن کیوں کر کروں
چھیڑتی ہیں جب وہ تیرا ذکر ان سے کیا کہوں

جو بڑی ہے وہ تو میری مان بھی جاتی ہے کچھ

اُس پہ جو گزری ہے آفت جان بھی جاتی ہے کچھ

آہ چھوٹی ہے جو لیکن اُس کو سمجھائے تو کون

تو نہ واپس آسکے گی اُس کو بتلائے تو کون

جاں ہے ننھی سی مگر کس کرب سے لبریز ہے

نو دمیدہ اُس کا یہ احساس کتنا تیز ہے

پوچھتی ہے مجھ سے اکثر "کتنا اب آئے گی"

"اور جب آئے گی تو میرے لئے کیا لائے گی"

"پھر کسولی کی طرف تنہا اُسے بھیجا ہے کیوں"

اور میں سر در گریباں ہوں کہ اس سے کیا کہوں

جب سراپا ایک استفسار بن جاتی ہے وہ

تو سمجھتی ہے فقط باتوں سے من جاتی ہے وہ

اس کے نغمے سے ہے دل میں کیا خبر کیا اضطراب
مجھ سے لیکن بن نہیں پڑتا کوئی اس کا جواب
رُوح میں چبھتا ہُوا کانٹا ہے اس کی بات بات
ہائے اک معصوم کے نغمے سے دل کے واردات

کسولی

کسولی! میری اُمیدوں کی دُنیا لوٹنے والی
کسولی! کوہِ غم کی طرح مجھ پہ ٹوٹنے والی
زمانے بھر کے سیّاحوں کو راحت بخشنے والی
مجھے لیکن شکست انجام محنت بخشنے والی
گلہ ہے مجھ کو تجھ سے اور تیری دلربائی سے
ترے اشجار کی جاں پروری سے جانفزائی سے

جنوں پرور فضاؤں سے سکوں پرور ہواؤں سے
ترے پھولوں کی رعنائی سے متوالی گھٹاؤں سے
گلہ ہے مجھ کو تیرے چیل کے اونچے درختوں سے
قریب و دُور تک پھیلے ہوئے پھولوں کے تختوں سے
ترے پہلو میں ہیں جو خیمہ زن اُن نوبہاروں سے
جو عقل و دل کو دیوانہ بنادیں اُن نظاروں سے
فضاؤں میں جو ہیں محوِ خرام اُن ابر پاروں سے
ہے روشن جن سے تیری انجمن اُن چاند تاروں سے
جنہیں دعویٰ مسیحائی کا ہے اُن لالہ زاروں سے
خرامِ ناز سے گرتی ہوئی ہلکی پھواروں سے
تری دُنیا کو کہہ دیتی ہے فردوسِ نظر دُنیا
نہ جانے کس قدر ہے کم سواد و بے بصر دُنیا

ترے حق میں کسولی اس طرح گویا زمانہ ہے
خدا جانے یہ اظہارِ حقیقت یا فسانہ ہے
کہ تجھ کو بِن پلائے مست کردینے کا دعویٰ ہے
دل و دیں سے خراجِ دل کشی لینے کا دعویٰ ہے
مگر افسوس میرا تجربہ کچھ اور ہی نکلا
جو سنتا تھا نرا اس سے نرالا طور ہی نکلا
مجھے کب ان تری دل کش فضاؤں میں قرار آیا
کہ ہر جھونکا صبا کا مثلِ تیغِ آبدار آیا
کسولی وہ الم پرور زمانہ یاد ہے تجھ کو
مری پیہم شکستوں کا فسانہ یاد ہے تجھ کو
جب آیا تھا یہاں میں اس فضا کا آسرا لیکر
گھٹاؤں کا، نسیمِ دِل کشا کا آسرا لے کر

گھنی جھیلوں کا سرو و یاسمن کا آسرا لے کر

چمن کا اور چمن کے بانکپن کا آسرا لے کر

گلستاں کی بہارِ جانفزا کا آسرا لے کر

جو فرحت بخشتی ہے اس ہوا کا آسرا لے کر

میں آیا تھا کہ شاید تو مجھے دل شاد کر دے گی

مرے دامن کو گلہائے طرب آگیں سے بھر دے گی

میں اپنے گھر سے جب نکلا تھا تیری آرزو لے کر

نظر میں ایک پیہم اضطرابِ جستجو لے کر

میں اک بیمارِ جانِ ناتواں کو ساتھ لایا تھا

اُمید و یاس کے اک کارواں کو ساتھ لایا تھا

ترے گھر میں اُمید و یاس کا وہ کارواں ٹھہرا

گلہ میں کیا کروں تجھ سے کہ آخر امتحاں ٹھہرا

تری اِس گلزمیں کو چھیننا جس کا پسند آیا
وہی ہموار تھا میری تمنّاؤں کا سرمایہ

کسولی! کیا عجیب آخر صلہ مجھ کو دیا تو نے
تجھے احساس تک اس کا نہیں ہے کیا کیا تو نے

بڑی حیرت ہے مجھ کو تیری شانِ بے نیازی پر
تری ہمدردیوں پر اور کمالِ چارہ سازی پر

ترے خوش رنگ و دلکش پھول اب بھی مسکراتے ہیں
ترے گلبن ترے اشجار اب بھی لہلہاتے ہیں

بلندی پر تری کالی گھٹائیں اب بھی آتی ہیں
جنوں پرور نشہ لے کر ہوائیں اب بھی آتی ہیں

مجھے حیرت سی ہے تیری چمن آرا اداؤں پر
تری کالی گھٹاؤں پر جنوں پرور ہواؤں پر

فروکش تیرے گلزاروں میں ہوتی ہے بہار اب بھی
بہاروں میں ترے پھولوں پہ آتا ہے نکھار اب بھی
ترے کہسار جب کالی گھٹا میں ڈوب جاتے ہیں
سُنا ہے میں نے لوگوں سے وہی منظر دکھاتے ہیں
گھٹائیں جب نشے میں مست ہو کر جھوم جاتی ہیں
تو اب بھی وہ تری گہرائیوں کو چوم جاتی ہیں
اُترتا ہے زمیں پر ابرِ منجاِ تہ بدوش اب بھی
بنا دیتا ہے ذرّے ذرّے کو وُہ بادہ نوش اب بھی
سنا ور بادلوں میں آج بھی رُوپوش ہوتا ہے
کوئی جیسے شرابِ کیف سے مدہوش ہوتا ہے
اُترتا ہے بلندی سے اگر گہرائی میں "پارا"
تو اب بھی اُس کی ہوتی ہے روانی ایک نظارا

اُٹھتا ہے خاک سے بادل اگر رفعت پہ چڑھتے ہیں
قدم سینے کو اُن کے دیدہ و دل اب بھی پڑھتے ہیں
مگر میں ہوں کہ اطمینان مجھ کو مل نہیں سکتا
مرے دل کا کنول تیری فضا میں کھِل نہیں سکتا
ترے ماحول میں اک برہمی محسوس کرتا ہوں
کہ ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس کرتا ہوں

گُم شُدگی

رہِ سفر میں ہمسفر! یہ کیا مقام آگیا
تڑپ اُٹھی اُمید حوصلہ شکست کھا گیا
خبر نہیں تری نگاہ میں یہ کیا سما گیا

خِرد جہانِ انتشار میں اُلجھ کے رہ گئی
نظر طلب کے خارزار میں اُلجھ کے رہ گئی
کبھی خزاں کبھی بہار میں اُلجھ کے رہ گئی

کچھ اُس مقام کا پتہ نہ چل سکا جہاں ہے تو
جو ابتدا میں ختم ہو گئی وہ داستاں ہے تُو
خبر نہیں کہاں ہے تو خبر نہیں کہاں ہے تُو

ترا نشاں نہ مل سکا فضائے قرب دُور میں
ستارۂ اُمید کھو گیا ہجومِ نُور میں
چمک کرن کی غرق ہو گئی ضیائے طُور میں

○

ظلمتِ یاس جب افکار میں لہراتی ہے
ایک ڈھلے ہوئے مہتاب کی یاد آتی ہے
مجھ سے اُس وقت کی کیفیتِ احساس نہ پُوچھ
ایک بجلی سی تخیّل میں تڑپ جاتی ہے

غزل

قرنوں سے بچھڑے تھے جو انساں آج وہ باہم ایک ہوئے

وقت نے ایسی کروٹ بدلی پورب پچھم ایک ہوئے

کس کا فیض ہے؟ لڑنے والے آج لڑائی بھول گئے

ایک ہوئی دونوں کی مسرّت دونوں کے غم ایک ہوئے

بس اتنی روداد سنی ہے روٹھ کے ملنے والوں کی

آگ بھرے دل سے رُوٹھے با دیدۂ پُرنم ایک ہوئے

انسانوں کو بانٹنے والو چال تم اپنی ہار گئے

دل کے ارادے یہ کہتے ہیں بٹ کر بھی ہم ایک ہوئے

رنگ الگ تھے تیور اور تھے اپنی اپنی رفعت تھی

ایک بلندی پر جب پہنچے سارے پرچم ایک ہوئے

رُباعی

احساس میں تو دمک رہی ہے گویا

پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا

آنکھیں ہیں کہ ہر لحظہ جھپک جاتی ہیں

شبنم پہ کرن تھرک رہی ہے گویا

وطن میں آخری رات

ہر طرف ایک پُراسرار خموشی ہے محیط
نہ وہ بیباک سا ٹھہراؤ نہ بدمست خرام

ہو گئے کون سی راتوں کا طربناک نصیب
وہ چمکتے ہوئے سکّے وہ کھنکتے ہوئے جام

اِس سے پہلے بھی کئی بار یہاں آیا ہوں
حُسن نے منزلِ عشرت میں اُتارا ہے مجھے
منتظر جھومتی باہوں کا اشارہ پا کر
ذرّے ذرّے نے بہر گام پُکارا ہے مجھے

نغمہ آباد میں یہ شہرِ خموشاں کا سکوت
زندگانی پہ عجب موت نے ڈالا سایہ
کان میں دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ کو اِسے جذبۂ مشتاق کہاں لے آیا

نہ سہی حاصلِ ہر شوق یہ دُنیا لیکن
اپنے سائے سے کبھی آپ ہراساں تو نہ تھی
خوف سے سینۂ احساس دھڑکتا تو نہ تھا
زندگی آپ ہی جلووں سے گریزاں تو نہ تھی

آج یہ لرزہ براندام اُجالا لیکن
آپ ہی آپ سمٹتا سا چلا جاتا ہے
کوئی برچھی کوئی خنجر کوئی پتھر کوئی اینٹ
مرے احساس کو ماحول سے خوف آتا ہے

قہقہے کتنے ترے سامنے دم سادھ گئے

اپنے اطوار ذرا دیکھ حکومت کی ہوس!

کتنی ہنستی ہوئی کلیاں تھیں کہ ویران ہوئیں

یُوں ترے شور سے جاگے ہیں اسیرانِ قفس

○

دوستوں کے کرم کی بات سُنا

دُشمنوں کے ستم کی بات نہ کر

غزل

بس ایک نور جھلکتا ہُوا نظر آیا
پھر اس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گذری
میں کاش تم کو بھی اہلِ وطن بتا سکتا
وطن سے دُور کسی بے وطن پہ کیا گذری

جُدا جب اس سے ہوئے اہلِ کوثر و تسنیم
نہ پُوچھ عالمِ گنگ و جمن پہ کیا گذری
مرے چمن میں بھی آئی تو تھی بہار مگر
میں کیا بتاؤں کہ اہلِ چمن پہ کیا گذری
یہ رازِ فاش تو کر مجھ پہ اے نسیمِ سحر
یہ بات کیا ہے یہ سرو و سمن پہ کیا گذری
وُہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر
نہ پُوچھ مجھ سے کہ اُس انجمن پہ کیا گذری
خموش کیوں ہیں قتیل و ندیم کچھ تو کہیں
ہمارے بعد ہمارے وطن پہ کیا گذری

سبھاش چندر بوس

بہادر شاہ ظفر کے مزار پر

السلام اے تاجدارِ کشورِ ہندوستاں

اے شہید! اے جاں سپارِ کشورِ ہندوستاں

السلام اے عظمتِ ہندوستاں کی یادگار

اے شہنشاہِ دیارِ دل! فقیرِ بے دیار

آج پہلی بار تیری قبر پر آیا ہوں میں

بے نوا ہوں نذر کو بے لوث دل لایا ہوں میں

سرمۂ چشمِ بصیرت اے ترے مرقد کی دھول

اک فقیرِ بے نوا کا ہدیۂ دل ہو قبول

گردشِ تقدیر کے ہاتھوں وطن سے دُور ہوں

ایک بلبل ہوں مگر صحنِ چمن سے دُور ہوں

شوق آزادی کا مجھ کو کھینچ لایا ہے یہاں

آج دشمن ہے زمیں میری عدو ہے آسماں

میں بھی ہوں اپنے وطن سے دُور تو بھی دُور ہے

ہاں رضائے پاکِ یزداں کو یہی منظور ہے

اے شہیدِ جنگِ آزادی! شہنشاہِ وطن

میں بھی آیا ہوں یہاں باندھے ہوئے سر سے کفن

میں نے بھی تلوار اُٹھائی ہے تری تقلید میں

اور لاتعداد بازو ہیں مری تائید میں

میرا دامن بھی یہاں کی خاک سے آلودہ ہے
فرق صرف اتنا ہے میں آوارہ تو آسودہ ہے

اے شہرِ خوابیدہ! اے تقدیرِ بیدارِ وطن
آئینہ میری نگاہوں پر ہے ادبارِ وطن

میرے دل کو یاد ہے اب تک وہ ستاون کی جنگ
جس کے بعد اس سرزمیں پہ چھا گئے اہلِ فرنگ

میری نظروں میں ہے میرٹھ اور دہلی کا زوال
جانتا ہوں میں جو تھا پھانسی کی رانی کا مآل۔

میں نہیں بھولا ابھی انجامِ ناناؔ فرنویس
ہے نظر میں کوششِ ناکام ناناؔ فرنویس

داستاں جیسی بھی ہو گزری وہ سب معلوم ہے
تیرے دلبندوں پہ جو گزری وہ سب معلوم ہے

ہاں تو اسے سرمایہ دارِ عزّتِ ہندوستاں

اے کہ تو ہے یادگارِ سطوتِ ہندوستاں

خاک تیری قبر کی میری زیارت گاہ ہے

آج اسی مٹّی سے میرے دل کو رسم و راہ ہے

سرمۂ چشم بصیرت ہے ترے مرقد کی خاک!

خاک ہے یہ سرزمینِ ہند کی مانند پاک

آج اسی مرقد پہ اپنا عزم دہراتا ہوں میں

دیس پر قربان ہونے کی قسم کھاتا ہوں میں

اے شہِ ہندوستاں اے لال قلعے کے مکیں

آسماں ہونے کو ہے پھر اس وطن کی سرزمیں

یہ وطن روندا ہے جس کو مدّتوں اغیار نے

جس پہ ڈھائے ظلم لاکھوں چرخ ناہنجار نے

جس کو رکھا مدتوں قسمت نے ذلت آشنا

جس نے ہر پہلو میں دیکھی پستیوں کی انتہا

آج پھر اس ملک میں اک زندگی کی لہر ہے

خاک سے افلاک تک تابندگی کی لہر ہے

آج پھر اس ملک کے لاکھوں جواں بیدار ہیں

حریت کی راہ میں مٹنے کو جو تیار ہیں

آج پھر ہے بے نیام اس ملک کی شمشیر دیکھ

سونے والے جاگ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ

اس طرح لرزے میں ہے بنیادِ ایوانِ فرنگ

کھا چکے ہیں مات گویا شیشہ بازانِ فرنگ

حبِّ قومی کے ترانوں سے ہوا لبریز ہے

اور توپوں کی دنادن سے فضا لبریز ہے

شور گیرودار کا ہے پھر فضاؤں میں بلند

آج پھر ہمت نے پھینکی ہے ستاروں پر کمند

پھر اُمنگیں آرزوئیں ہیں دلوں میں بیقرار

قوم کو یاد آ گیا ہے اپنا گم گشتہ وقار

نوجوانوں کے دلوں میں سرفروشی کی اُمنگ

عشق بازی لے گیا ہے عقل بیچاری ہے دنگ

آج پھر اس دیس میں جھنکار تلواروں کی ہے

کچھ نرالی کیفیت پھر دیس پیاروں کی ہے

جو توانائی ارادوں میں ہے انسانوں کی ہے

ذرّے ذرّے میں نہاں تابندگی تاروں کی ہے

یہ نظارہ آہ لفظوں میں سما سکتا نہیں

"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں"

فتح و نصرت کی دعاؤں سے ہوا معمور ہے
نعرۂ "جے ہند" سے ساری فضا معمور ہے

مجھ کو اے شاہِ وطن! اپنے ارادوں کی قسم
جن کے سر کاٹے گئے اُن شاہزادوں کی قسم
تیرے مرقد کی مقدّس خاک کی مجھ کو قسم
میں جہاں ہوں اُس فضائے پاک کی مجھ کو قسم
اپنے بھوکے جاں بلب بنگال کی مجھ کو قسم
حاکموں کے دست پروردہ کال کی مجھ کو قسم
لال قلعے کی، زوالِ شہرِ دہلی کی قسم
محسنِ دہلی! مآلِ شہرِ دہلی کی قسم
میں تری کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لاؤں گا
اور ترے مرقد پہ نصرت یاب ہو کر آؤں گا

تیغِ ہندی جس کا لوہا مانتا ہے اک جہاں
جس کی تیزی کی گواہی دے رہا ہے آسماں

تیغِ ہندی جس کو میں نے کر دیا ہے بے نیام
جس کا شیوہ حرّیت کیشی جہانگیری ہے کام

جس نے پوری منصفی کی آج تک دنیا کے ساتھ
ظلم کی دشمن ہے جو اک ظلم بے پروا کے ساتھ

ہر قدم پر جس نے باطل کو ملایا خاک میں
جس کے ساکھوں کی ابھی تک گونج ہے افلاک میں

آج پھر اپنی نظر جس کی چمک سے خیرہ ہے
جس کی تابانی سے روشن اک جہانِ تیرہ ہے

اک جزیرے کے حسیں ساحل سے جب ٹکرائے گی
چین سے مجھ کو بھڑکتی آگ میں نیند آئے گی

آزاد ہند فوج

۱۹۴۶ء

پائندہ باد ہند کی اے فوجِ خوش نہاد

وہ دن خدا کرے کہ بر آئے تری مُراد

مٹ جائے بزمِ دہر سے یہ جنگ یہ فساد

زنداں کو توڑ پھوڑ دے اے حرّیت نژاد

اب وقت آگیا ہے کہ ہو عازمِ جہاد

ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد

پرچم ترا ہو چاند ستاروں سے بھی بلند
پہنچا سکے نہ دَورِ زمانہ تجھے گزند
اغیار کر سکیں نہ کبھی تجھ پہ راہ بند
پسپائیاں ہوں تیرے جوانوں کو ناپسند
تو کامراں ہو اور عدو تیرے نامراد
ہندوستاں کی فوجِ ظفر مَوج زندہ باد!

جے ہند" کی صداؤں میں تیرے جواں بڑھیں"
ہاتھوں میں لے کے امن و اماں کا نشاں بڑھیں
نُصرت نصیب اُن کے قدم ہوں جہاں بڑھیں
ہمسرِ وقار و عظمتِ ہندوستاں بڑھیں
دنیا کو بھی وہ شاد کریں ہند کو بھی شاد
ہندوستاں کی فوجِ ظفر مَوج زندہ باد!

غزل

خرد کا سفینہ جنوں کے ہیں دھارے
کبھی اِس کنارے کبھی اُس کنارے
نگاہیں تھیں اور مہوشوں کے نظارے
کچھ ایسے بھی ایّام ہم نے گزارے
محبّت کا دریا وفا کا سفینہ
یہ سب پاک موتی ہیں یہ سب تابدارے!

فقط اک نظر کے ہیں محتاج اے دل
یہ رنگیں شفق یہ حسیں چاند تارے

کٹھن منزلیں تھیں وفاؤں کی لیکن
میں بڑھتا گیا بے خودی کے سہارے

تری جستجو میں مری آرزو نے
بہت رنگ بدلے بہت روپ دھارے

نہ ذرّوں کو ان سے کوئی فیض پہنچا
چمکتے رہے آسماں پر ستارے

وُہ خورشید نکلا وہ خورشید نکلا
وُہ ڈوبے ستارے وہ ڈوبے ستارے

عجب شے ہے آزاد ذوقِ نظر بھی
ہُوئیں منزلیں طے اسی کے سہارے

اے دل!

رابندرناتھ ٹیگور کی ایک نظم

ہو ذوق و شوق کی منزل کا رہ سپار اے دل
جو رہ گئے ہیں نہ کر اُن کا انتظار اے دل
ہے صبح محفلِ عالم میں جلوہ کار اے دل
فلک پہ ذکر ہوا تیرا بار بار اے دل

شبِ سیاہ میں حاصل ہوں شبنمی گوہر
یہی ہے آرزوئے غنچہ کا کمال مگر
کمالِ آرزوئے گُل وصالِ نورِ سحر
وجودِ تیرہ سے تو بھی ہو آشکار اے دل

ہو ذوق و شوق کی منزل کا رہ سپار اے دل
جو رہ گئے ہیں نہ کر اُن کا انتظار اے دل

○

بزمِ خرد میں قدرِ جنوں کا سوال کیا
ہم آ گئے تھے چاکِ گریباں سئے بغیر

غزل

اک پیکرِ طلسم ہے دُنیا نہیں کچھ اور
اس کے سوا نگاہِ تماشا! نہیں کچھ اور

تیرے بغیر آ نہ سکا روح کو قرار
تیرے بغیر دل میں تمنّا نہیں کچھ اور

جچتی نہیں چمن کی بہاریں نگاہ میں
یارب! یہ حُسن و رنگ کی دنیا نہیں کچھ اور

روزِ ازل کہ ملنے لگی تھی یہ کائنات

کہنا یہ چاہیئے تھا کہ دُنیا نہیں کچھُ اور

ذوقِ نظر بلند رہے اب حُسن و رنگ سے

اب حُسن و رنگ دل کو گوارا نہیں کچھُ اور

ہاں ہاں نہیں ہے دل کو مداوے کی آرزو

ہاں ہاں دلِ حزیں کا مداوا نہیں کچھُ اور

دُنیا میں خونِ آرزوئے دل کے ماسوا

آزاد کی نگاہ نے دیکھا نہیں کچھ اور

سفر میں ایک شام

اُونچے کہسار کے اُس جانب جلوؤں کا فسوں گم ہونے لگا

امن اور سکوں کے دامن میں ہنگامۂ عالم سونے لگا

دُنیا سے تجلّی جانے لگی ہر شے پہ تیرگی چھانے لگی

میدانِ ظلمت کے پانی سے ہر بادل کا منہ دھونے لگا

یہ دلکش و ہیبت ناک سماں ظلمات کی یہ لہریں سی رواں

یہ دل کو مرے کیا ہونے لگا دل صبر و سکوں کیوں کھونے لگا

اے کاش یہ راز بتا دے کوئی اس بھید سے پردہ اٹھا دے کوئی

یہ کون ہے جو یاد آ آ کر نشتر سے دل میں چبھونے لگا

○

ہوئی ہیں بارہا اُن کی نگاہیں ملتفت لیکن

مرا دل ہے کہ اب تک حدِ فاصل یاد رکھتا ہے

یہ مانا اِک زمانہ ہو گیا بچھڑے ہوئے لیکن

تمہیں اے بھولنے والو! مرا دل یاد رکھتا ہے

مری غربت کی شامیں ہیں تمہاری یاد سے روشن

تمہیں قلبِ حزیں منزل بہ منزل یاد رکھتا ہے

ایک غزل کے چند اشعار

مری خرد کا تو آوارگی شعار نہیں
خبر نہیں کہ نگاہوں کو کیوں قرار نہیں

کبھی وہ دن تھے کہ کانٹوں سے انس تھا دل کو
ہے اب یہ حال کہ پھولوں سے اس کو پیار نہیں

نہیں یہ عذر کہ ہوں نیک و بد سے ناواقف
ہوں معترف کہ ارادوں پہ اختیار نہیں

اگرچہ سوزِ نفس کا مگار ہو نہ سکا
مگر یہ کم ہے کہ منّت کشِ بہار نہیں؟

چمن کی ارضِ دلآرا کو کیا ہُوا یارب
کہ نوبہار میں وہ رنگِ نوبہار نہیں

ہر ایک پُھول نے رازِ بہار فاش کیا
بس ایک تُو ہی نگاہوں پہ آشکار نہیں

۱۹۳۶ء

چاندنی رات

چاندنی رات مسلّط ہے کہستانوں پہ
دُور گہرائی میں جاتی ہوئی ڈھلوانوں پہ
عیش و آرام سے معمُور شبستانوں پہ
دردِ ایّام سے لبریز الم خانوں پہ
چاندنی رات! دلآویز ہے افسانہ ترا
بادۂ کیف سے لبریز ہے پیمانہ ترا

روشنی تجھ سے ہے آبادی میں ویرانے میں
کاخِ زردار میں مزدور کے کاشانے میں

سب کا حصّہ ہے شبِ مسرّت کے پیمانے میں
سبھی مے خوار ہیں یکساں ترے میخانے میں

ترے انوار ہیں فردوسِ نظر سب کے لئے
ترے دامن میں ہیں لعل اور گہر سب کے لئے

جگمگا اُٹھّا ترے فیض سے کہسارِ مری
شجرِ طور کی مانند ہیں اشجارِ مری

پیکرِ نور ہے ہر کوچہ و بازارِ مری
قابلِ دید ہے کیا رونقِ گلزارِ مری

ذرّے ذرّے سے عیاں شانِ دل آرائی ہے
اور ہر برگِ شجر پیکرِ زیبائی ہے

چاندنی شب کا پہاڑوں پہ سماں دیکھتا ہوں

خاک پر نور کا دریا ہے رواں دیکھتا ہوں

گرچہ ہر شے کو حسیں اور جواں دیکھتا ہوں

دل کی گہرائی میں اک سوزِ نہاں دیکھتا ہوں

رفعتِ کوہ پہ ہوں فکر کہاں پھرتا ہے

پستیٔ ہند کا آنکھوں میں سماں پھرتا ہے

چاند! جب عالمِ ظلمت کو زوال آتا ہے

اور تو عرش پہ با حسن و جمال آتا ہے

دلِ غمناک میں اکثر یہ خیال آتا ہے

جس سے امید کی دنیا پہ ملال آتا ہے

کیا کبھی ہو گی نہ پُر نور شبِ تارِ وطن ؟

اور شاداب نہ ہو گا کبھی گلزارِ وطن ؟

۱۹۳۶ء

غزل

بزمِ جہاں میں آدمی ذوقِ شعور کے سوا

آنکھ ہے نور کے سوا بادہ سرور کے سوا

دل پہ تری تجلیاں راز یہ کر گئیں عیاں

اور بھی ہیں ترے مقام رفعتِ طور کے سوا

آنکھ کا نور ہے فضول آنکھ کے نور پر نہ بھول

اور بھی ایک نور ہے آنکھ کے نور کے سوا

قولِ[1] حکیم ہند سے مجھ پہ عیاں ہُوا کہ علم
ایک بہشت ہے مگر جلوۂ حُور کے سوا
اس کے رموز[2] نے کیا مجھ پہ یہ راز فاش تر
اور بھی اک کلیم ہے صاحبِ طُور کے سوا

۱۹۳۸ء

---

[1] علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنّت ہے جس میں حُور نہیں

[2] رموزِ بے خودی۔

قطعہ

۱۹۴۷ء

نصف شب کو شہر میں اک آتشیں گولہ پھٹا
شہر کے سارے اندھیرے روشنی میں کھو گئے
کیا خبر گل ہو گئے کتنی اُمیدوں کے چراغ
کیا خبر اِس نور میں کتنے نصیبے سو گئے

اشعار

غنچۂ دِل نہ کھِل سکا اپنا پتہ نہ مل سکا

اپنی تلاش کا مآل درد کا ایک سلسلہ

اہلِ جہاں کی بے رُخی گرچہ ہے دِل شکن مگر

عزم بلند ہو اگر سخت نہیں یہ مرحلہ

خرد سمجھ نہ سکے گی جنوں ہی سمجھے گا
تری نظر کے اشارے بدلتے رہتے ہیں

○

دعا تو لب پہ ہے وصلِ حبیب کی لیکن
یہ ہائے ہائے کی لذت کہاں سے لاؤں گا
ابھی کچھ اور بڑھاؤں گا داستانِ وفا
ابھی کچھ اور زمانے کو آزماؤں گا
سنائے تو نے جو نغمے مجھے خموشی میں
زبانِ شعر میں تجھ کو وہی سناؤں گا

○

• دردِ جدائی دینے والے اتنی بات بتاتا جا
تو جب ہوگا دور نظر سے درد کا درماں کیا ہوگا

یہ رازِ عقلِ عقدہ کشا پر نہ کھل سکا
جانا کہاں ہے آئے جہاں میں کہاں سے ہم

ہو خوف کیوں خزاں کا بہاروں سے پیار کیوں
واقف ہیں جب فریبِ بہار و خزاں سے ہم

منزل اگرچہ اب بھی بہت دُور ہے مگر
آگے نکل گئے ہیں بہار و خزاں سے ہم

کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے
ایسے کٹے ہوئے ہیں کسی داستاں سے ہم

○

جو میں تھک کے دردِ تلاش سے یہ پکار اُٹھا ہے کہاں کوئی
تو حریمِ روح نے دی صدا کہ یہیں کہیں ہے نہاں کوئی

موت اگر آساں نہیں ہے جینا بھی آسان نہیں

موت کو مشکل جاننے والے جینا موت سے مشکل ہے

○

پھری نگاہِ تمنّا چمن چمن لیکن

کہیں وہ زینتِ فصلِ بہار مل نہ سکا

لارنس باغ میں ایک لمحہ

جلوہ گر مہتاب ہے افلاک پر
نور کا دریا رواں ہے خاک پر
عالمِ امکاں پہ طاری ہے سکوت
دہر کی ہر شے میں ساری ہے سکوت
ذرّہ ذرّہ باغ کا خاموش ہے
دم بخود صرصر فضا خاموش ہے
پھول چپ، غنچے ہیں، کلیاں ہیں چپ
شاخ پر مرغانِ خوش الحاں ہیں چپ

خار چُپ پتے ہیں چُپ اشجار چُپ
الغرض گلزار کا گلزار چُپ
ہر طرف ہے اک سکوں چھایا ہُوا
باغ ہے زیرِ فسوں آیا ہُوا
یہ فضا یہ خامشی پرور سماں
یہ تجلّی یہ سکونِ بیکراں
باغ میں پھول آسماں پر کہکشاں
کہکشاں کیا حُسن کی جوئے رواں
غنچہ و گُل کا نظارا باغ میں
حُسنِ فطرت آشکارا باغ میں
آسماں پر چاند تاروں کا سماں
آہ! نُورانی غباروں کا سماں

سبزہ زاروں میں اُلجھتی ہے نظر
نور پاروں میں اُلجھتی ہے نظر
بادلوں میں ماہِ تاباں کا سفر
کر رہا ہے ایک جادو رُوح پر
گاہ پنہاں ہے پسِ ابرِ رواں
گاہ ظاہر ہے حجاب و ضو فشاں
چاند ہے اک پیکرِ زیبائے نُور
چاندنی بہتا ہُوا دریائے نُور
ہیں ستاروں کی نگاہیں خاک پر
میری چشمِ نور بیں افلاک پر
چاندنی سے باغ ہے دھویا ہُوا
دل ہے اس ماحول میں کھویا ہُوا
۱۹۳۸ء

غزل

دُنیا ہے اک محفلِ عشرت دُنیا ہے اک غم خانہ

یُوں بھی دل کا افسانہ ہے یُوں بھی دل کا افسانہ

ایک سمجھتا ہے دیوانہ کعبہ ہو یا بُت خانہ

یہ اک خلوتِ جانانہ ہے وہ اک جلوتِ جانانہ

کیونکر ہو مفقود رقابت شیخ و برہمن میں آخر

یہ بھی تیرا دیوانہ ہے وُہ بھی تیرا دیوانہ

دل بھی ایک عجب بستی ہے دُنیا کے معمورے میں

آبادی کی آبادی ہے ویرانے کا ویرانہ

میرے دل میں بسنے والے! آنکھوں سے کیوں دُور ہے تو

آنکھ بھی تیرا کاشانہ ہے دل بھی تیرا کاشانہ

تُو بھی اے آزاد! عجب انسان ہے فانی دُنیا میں

بزم کی بزم ہے شمع کی شمع ہے پروانے کا پروانہ

۳۸ء

کنارِ راوی

یہ وقتِ شام یہ آبِ رواں یہ تنہائی
سکوتِ شام میں قدرت کی محفل آرائی

فضا میں تین طرف سے ہجومِ ظلمت کا
اور ایک سمت شفق کا وہ رنگِ زیبائی

بجھی وہ چشم زدن میں شفق کی شمعِ حیات
فلک پہ چار طرف گھر کے تیرگی چھائی

وہ تیرگی کے نظارے کا رنگ کیف بڑھا
سجی حسین ستاروں سے سقفِ مینائی

وہ بزمِ عالمِ بالا میں جلوۂ مہتاب
زمیں کا حسن بڑھانے کو چاندنی آئی

ٹھہر کہ راہزنِ صبر و ہوش ہیں دونوں
خرامِ ناز ترا اور شانِ برنائی

ہر ایک موج سے اندازِ دلکشی ظاہر
ہر اک حباب سے بے پردہ رازِ رعنائی

یہ شامِ دشت یہ اُس پہ سکوتِ سحر آمیز
فضا میں ہے کسی ساحر کی کارفرمائی

یہ شہر ہے کہ خموشی میں نوحہ خواں بیدار
کہ جن کے سائے میں اک بادشہ کو نیند آئی

شکستہ حال سرِ راہ ایک بارہ دری
جہاں ہے تو یہ جہاں وقفِ کنجِ تنہائی

کہاں وہ شانِ حکومت کہاں وہ کیفِ حرم

کہاں وہ بزمِ شہی کا جلالِ دارائی

کہاں یہ دشتِ مغیلاں کہاں وہ بستۂ گُل

کہاں سے آہ اُسے بے کسی کہاں لائی

کہاں وُہ محفلِ رنگیں کہاں وُہ بزمِ نشاط

کہاں یہ عالمِ ہُو اور فضائے صحرائی

ٹھہر ٹھہر دلِ شاعر! یہ وہ نظارا ہے

کہ جس کے چاند ستارے بھی ہیں تماشائی

تماشا گاہِ زمانہ کو دیکھنے والے!

یہ دیکھ خاک میں سوتا ہے نورِ سینائی

مری نگاہ میں اے کاش نیند بھر دے کوئی

نہیں ہے چشمِ نظارہ کو تابِ بینائی

سنہ۳۳ء

غزل

مری حسرتِ نظر ہے اور میں ہوں
قریبِ رہگزر ہے اور میں ہوں
اُدھر دنیا ہے اور دُنیا کی نظریں
اِدھر میرا ہُنر ہے اور میں ہوں
نگاہوں میں نہیں جچتیں بہاریں
مرا ذوقِ نظر ہے اور میں ہوں

ہُنر میرا وہی افکارِ بے ربط

زمانے کی منظر ہے اور میں ہوں

وہی تجلی وہی عالم، وہی رُت

خیالِ بال و پر ہے اور میں ہوں

وہی دنیا وہی دنیا کے انداز

وہی میرا ہنر ہے اور میں ہوں

مجھے کیا واسطہ منزل سے آزاد

مرا ذوقِ سفر ہے اور میں ہوں

بیڑا کون لگائے پار

بجلی چمکی بادل گرجا گونج اُٹھا سنسار
لہروں کی آواز ہے یا ہے سانپوں کی پھنکار
آپس میں ہیں چار عناصر لڑنے کو تیار
دُور بھی اور نزدیک بھی پیدا موت کے ہیں آثار

بیڑا کون لگائے پار؟

مٹی پانی آگ، ہوا میں جاری ہے بیکار
سب تدبیریں مات ہوئی ہیں تجویزیں بیکار
چپّو ہاتھ سے چھوٹ چکے ہیں، ٹوٹ چکی پتوار
ایسے وقت میں اپنی ٹوٹی ناؤ پھنسی منجدھار

بیڑا کون لگائے پار؟

چاروں سمت آکاش پہ چھائے بادل ہیں گھنگھور
تند ہوا نے آج لگایا اپنا سارا زور
ساگر کے سینے پہ مچایا لہروں نے وہ شور
کان پڑی آواز کا جس سے سننا ہے دشوار

بیڑا کون لگائے پار؟

تلاش

گرچہ ہے مجھے بہت
اپنی زندگی عزیز
ایک چیز ہے مگر
زندگی سے بھی عزیز

کیفِ نوبہار کی
تازگی سے بھی عزیز
فلسفے سے بھی عزیز
شاعری سے بھی عزیز

برگِ گل سے بھی عزیز گلستاں سے بھی عزیز
ماہِ نو سے بھی عزیز کہکشاں سے بھی عزیز

جامِ مے سے بھی عزیز چنگ و نے سے بھی عزیز
نغمہ خوان طیور کی مست لے سے بھی عزیز

اُس کی اک نگاہ سے دل مرا حریفِ طور
پرتوِ جمال سے میری روح میں سرور

میرے ذوقِ فکر میں زندگی اسی سے ہے
نو بہارِ شعر میں تازگی اسی سے ہے

نغمۂ نشاط میں   زیر و بم اسی سے ہے
بادۂ حیات میں   کیف و کم اسی سے ہے

اس کے باوجود وہ   دل پہ ایک راز ہے
دل پہ راز ہے مگر   پھر بھی دلنواز ہے

○

انجام جانتا ہوں میں اُن کا کر یا رہا
میں نے سفر کیا ہے بہاروں کے ساتھ ساتھ

غزل

بہار میں فروغِ گلستاں کو بے وقار کر
جمالِ دل فریب کو حسرتِ لالہ زار کر

چمن میں خامشی سی ہے فضا اُداس اُداس ہے
چمن کو خواب سے جگا فضا کو بے قرار کر

اگر ہو دوست ملتفت غمِ زمانہ بھول جا
بس ایک زیرِ لب ہنسی پہ درد و غم نثار کر

وہ دورِ زندگی ہی کیا کہ جس میں حادثے نہ ہوں

کسی سے دل کا راز کہہ کسی کا انتظار کر

ہوس پرست اذیت کی نشاط اور چیز ہے

مذاقِ دل بلند کر نظر کو اُستوار کر

نشانِ منزلِ طلب نظر کی حد سے دُور ہے

جو دِل میں حوصلہ نہیں تو صبر اختیار کر

ترے کمال کی قسم ترا ہی ایک نقش ہوں

سنوار دے بگاڑ کر بگاڑ دے سنوار کر

جوش کے بعد

ہمنشیں پوچھ نہ آزاد سے تو، کیا ہوگا
عالمِ انجمنِ دیدہ وراں جوش کے بعد

ہوگی اس طرح سے برہم کہ سجے گی نہ کبھی
آج کی محفلِ صاحب نظراں جوش کے بعد

جانتے ہیں ادب و شعر کا ہوگا جو نصیب
ہم کو معلوم ہے انجامِ زباں جوش کے بعد

یہ بھی کہنا نہیں آسان مِلے گا کہ نہیں
ادب و فن کا کوئی نام و نشاں جوش کے بعد

ایک آوازِ فغاں ہوگی لبِ اردو پہ
سینۂ شعر سے اُٹھے گا دُھواں جوشؔ کے بعد

ذہن و افکار پہ چھائے گی یقیں کی ظلمت
سرد ہو جائے گی قندیلِ گُماں جوشؔ کے بعد

تشنہ لب فکر اندھیرے میں بھٹکتا ہوگا
مضطرب شوق نہ پائے گا اماں جوشؔ کے بعد

صحنِ گلزار سے روتی ہوئی جائے گی بہار
مسکراتی ہوئی آئے گی خزاں جوشؔ کے بعد

حسرتِ دیدہ میں آ آ کے پریشاں ہوگا
سرِ کہسار گھٹاؤں کا دُھواں جوشؔ کے بعد

سرِ مے خانہ سے آ آ کے پلٹ جائے گا
پیہم یہ پیہم سلسلۂ ابرِ رواں جوشؔ کے بعد

کچھ بڑی بات نہیں ہے جو شکستہ ہو جائے
بزم میں حوصلۂ پیرِ مغاں جوشؔ کے بعد

اپنی تقدیر پہ فریاد کریں گے شب و روز
مئے دیرینۂ و معشوقِ جواں جوشؔ کے بعد

دلبراں گلبدناں سیم تناں ماہ وشاں
ان کو دیکھے گی نظر تا بہ کُناں جوشؔ کے بعد

کیا خبر عالمِ بیچارگیٔ حُسن ہو کیا
کیا کہوں بے کسیٔ عشقِ جواں جوشؔ کے بعد

لیلیٔ شعر کے لب پر یہ سوال آئے گا
کون ہے آج مرا مرتبہ داں جوشؔ کے بعد

دے سکا کوئی جو تسکین تو دے گا اس کو
فقط آزاد کا اندازِ بیاں جوشؔ کے بعد

غزل

جب جوشِ جنوں ہو گرمِ سفر وہ بند و سلاسل کیا جانے
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندئ ساحل کیا جانے

جو برق میں ضَو ہے شمع میں لَو پارے میں تڑپ کوندے میں لپک
پابندِ طلسمِ دیر و حرم وُہ درد ترا دل کیا جانے

وہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو
اِس راز کو رہبر کیا سمجھے اِس بھید کو منزل کیا جانے

ہر گام پہ کیوں بل کھا کھا کر بے تاب بگولے اُٹھتے ہیں
محمل کو اِس کی خبر کیا ہے اس بات کو محمل کیا جانے

منجدھار میں جب کشتی پہنچی، کشتی والوں پہ کیا گذری
یہ طوفانوں کی باتیں ہیں آسودۂ ساحل کیا جانے

جب عشق ہوا اپنی دُھن میں رواں بخوفِ خطرِ منزل کی طرف
وہ راہ کی مشکل کیا سمجھے وہ دُوریٔ منزل کیا جانے

آزاد ہے محوِ جہد و عمل انجام پہ کیا ہے اس کی نظر
یہ کِشتِ عمل کا دیوانہ اس کِشت کا حاصل کیا جانے

ماتمِ اقبال

پھر نالہ ہائے غم سے ہے لبریز دل کا ساز
پھر ہوگیا ہے دیدۂ حیراں گہر طراز

وہ حق شناسِ فلسفی و مردِ نکتہ داں
وہ باکمال شاعر و درویشِ پاکباز

نغمے تھے جس سخنورِ عالی دماغ کے
مشرق میں دلپذیر تو مغرب میں جاں نواز

تیرا اجل نے اُس کو نشانہ بنا دیا

تھا ہم کو آہ جس کے کمالِ سخن پہ ناز

محفل سے آج ساقیٔ محفل ہی اُٹھ گیا

آزاد اب کہاں وُہ شرابِ جگر گداز

ہر بزم وقفِ نالۂ غم ہے ہزار حیف

خونابہ بار دیدۂ نم ہے ہزار حیف

اقبال! اے جہانِ معانی کے تاجدار

اے رومی و سنائی و غالب کی یادگار

معنی کو تجھ پہ فخر، تخیّل کو تجھ پہ ناز

نازاں تھا تجھ پہ مشرق و مغرب کا ہر دیار

آتش کا سوز، گُل کی مہک، برق کی تڑپ

سو جاں سے ہو گئے تری تخئیل پر نثار

تو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا
تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار
دو گز زمین آہ تجھے راس آ گئی
شہرت پہ تیری تنگ تھا دامانِ روزگار
گو زیرِ خاک کالبدِ خاک آ گیا
تو رُوح بن کے عالمِ جاں میں سما گیا
اے مزرعِ سخن پہ برستے ہوئے سحاب
اے مطلعِ وطن کے درخشندہ آفتاب
جاں بخش تیری نظم کا ہر استعارہ ہے
ہر لفظ بے مثال ہے ہر شعر لاجواب
اب آ کے کون دے گا گلِ شعر کو مہک
بخشے گا کون گوہرِ معنی کو آب و تاب

کہتے ہیں ترجمانِ حقیقت بجا تجھے

ہر رازِ حق تھا دیدۂ باطن پہ بے نقاب
رُتبہ تری خودی کا نہایت بلند تھا
تجھ سے ترے خدا نے کیا بارہا خطاب
اِس دَور میں تو آگہِ رازِ قدیم تھا
جو ہو حریفِ جلوۂ حق وہ کلیم تھا
جس کی صداؤں پر ہمہ تن گوش تھے سروش
وہ جامِ رُوح پروَرِ عرفاں کا بادہ نوش
جس کی نوا سے نادرِ افغاں[1] تڑپ اُٹھا
اُف ہو گیا وُہ شاعرِ آتش نوا خموش

---

[1] مسوختیم از گرمیٔ آوازِ تو | اے خوش آں قومے کہ داند رازِ تو
از غمِ تو ملّتِ ما آشنا است | می شناسیم ایں نوا ہا از کجا ست

رنگیں[1] تھا جس کے حسنِ تجلّی سے برگِ گل
جس کی گرج سے موجۂ طوفاں میں تھا خروش
سینوں میں جس نے قوّتِ گفتار سے بھرا
صہبائے بے خودی کا سرور و عمل کا جوش

اے بآغوشِ سحابِ ما چو برق | روشن و تابندہ از نورِ تو شرق
یک زماں در کوہسارِ ما درخش | عشق را باز آں تب و تابے بہ بخش

تا کجا در بند و غم باشی اسیر
تو کلیمی راہِ سینائے بگیر"

(مسافر)

---

[1] برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است | مصرعِ من قطرۂ خونِ من است

(پیامِ مشرق)

تھا جس کے سانس میں ہنگامۂ حیات

تربت ہے اُس کی سایۂ مسجد میں سبز پوش

ہے خاک میں وہ عرشِ معانی ہزار حیف

اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف

۱۹۳۸ء

○

ابھی اِس راہ سے واقف نہیں دل

خودی کی چاہ سے واقف نہیں دِل

ابھی دل میں ہے خاشاکِ من و تُو

کہ تیری آہ سے واقف نہیں دِل

رُباعیات

ہر نظم تری ہے آسمانِ معنی

ہر شعر ترا ہے کہکشانِ معنی

کیا نیرؔ ترے کلام کی ہو توصیف بیاں

ہر لفظ میں بستا ہے جہانِ معنی

ہر شوق ہے شیدائے کلامِ اقبال
ہر فکر ہے وارفتۂ کلامِ اقبال
کیا خوب گرامی نے کہا ہے آزاد
"شہبازِ معانی است بہ دامِ اقبال"

○

لبریزِ حقیقت ہے پیامِ اقبال
الہام ہے الہام کلامِ اقبال
دل کش نغمات میں کشش کتنی ہے
آزاد ہوا اسیرِ دامِ اقبال

ہر بزم کی زینت ہے فسانہ تیرا
مدّاح ہے حشر تک زمانہ تیرا
لب بند کئے بستر سے اجل نے لیکن
ہر دل میں ہے مرتعش ترانہ تیرا

تضمینات

(۱)

فرمانِ خدا

فرشتوں سے

مختاج و غنی میں جو تفاوت ہے مٹا دو

انسان کو انسان کا ہمدرد بنا دو

اربابِ رعونت کو رعونت کی سزا دو

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو

پیدا کرو انوارِ عمل رُوئے زمیں سے
بڑھ کر ہوں چمک میں جو ستاروں کی جبیں سے
تعمیر ہو اک عالمِ پائندہ یہیں سے
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

ہر لب پہ ہے آزادئ کامل کا ترانہ
اس دَور میں شاہوں کی حکومت ہے فسانہ
درکار ہے اس قصر کے گرنے کو بہانہ
سُلطانئ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہُن تم کو نظر آئے مٹا دو

جب نورِ ازل مژدۂ پیغامِ سحر دے

ظلمت گہِ آفاق میں کیوں جان بشر دے

مابین جو پردے ہیں کوئی چاک انہیں کر دے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے

پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

یہ عالمِ نو ایک عجب رَو پہ رواں ہے

بے راہ روی اس کی تباہی کا نشاں ہے

افزائشِ سامانِ طرب کاہشِ جاں ہے

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے

آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

(۲)

دُعا

میرا دلِ مطمئن طالبِ نانِ شعیر
قیدِ جہاں سے بَری گرچہ بظاہر اسیر
مجھ میں نہ پیدا ہُوا شوقِ لباسِ حریر
دولتِ لعل و گہر میری نظر میں حقیر
می نہ بَرَد حاجتے پیشِ سلاطیں فقیر
میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

صحبتِ اہلِ صفا حُسنِ ازل کا ظہور
صحبتِ اہلِ صفا وادیٔ ایمن کا نُور
صحبتِ اہلِ صفا دُشمنِ فسق و فجور
دُشمنِ فسق و فجور حاملِ ذوقِ حضور
حاملِ ذوقِ حضور قاطعِ کبر و غرور
صحبتِ اہلِ صفا نُور و حضور و سرور
سرخوش و پُرسوز ہے لالۂ لبِ آبِ جو

خالقِ کون و مکاں مالکِ غیب و حضور
میری مئے زیست میں تیرے کرم سے سرور
روح کی گہرائی میں فیض ترا دُور دُور
عالمِ تاریک میں تیری تجلّی سے نُور

تجھ سے ہے سینہ مرا رُوکشِ کہسارِ طُور
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صُبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہو

میری تمنّاؤں کا پھُول نہ اب تک کھِلا
سوز و تب و تاب و غم میری طلب کا صلہ
آرزوئے شوق میں اور مجھے کیا مِلا
رُوح میں موجود ہے درد کا اک سلسلہ
عزم کو درپیش ہے صبر شکن مرحلہ
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سُو

(۳)

محراب گل افغان کے افکار

(۱)

رشتۂ حبِّ وطن توڑ کے جاؤں کہاں
تیری فضاؤں سے مُنہ موڑ کے جاؤں کہاں
میرے کہستاں تجھے چھوڑ کے جاؤں کہاں
تیری چٹانوں میں ہے میرے اب و جد کی خاک

تیری ہوا دل کشا، تیری فضا دل نشیں
تجھ سے دلآرا نہیں اور کوئی سرزمیں
تیرے خم و پیچ میں میری بہشتِ بریں
خاک تری عنبریں، آب ترا تابناک

عرش سے بھی ہے بلند میری خودی کا مقام
خواہشِ بزمِ شہی مجھ پہ سراپا حرام
باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظِ بدن کے لئے رُوح کو کردوں ہلاک

ایک طرف بزمِ رنگ ایک طرف یہ فضا
ایک طرف اہرمن، ایک طرف ہے خدا
اے مرے فقرِ غیور! فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

زمانہ روزِ ازل سے یہ دے رہا ہے پیام
وہی ہے زندہ سکوں کی طلب ہے جس پہ حرام
حقیقتِ اَزَلی ہے رقابتِ اقوام
نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز نہ تُو

نظر نہ آئے گا تجھ کو کوئی حریف ترا
نہ ہو گا تیرے جہاں میں کوئی بھی تیرے سوا
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اُتر گیا جو ترے دل میں لَا شَرِیکَ لَہٗ

(۳)

ترے لہو میں سرورِ شراب ہو پیدا
تری ضعیفی میں رنگِ شباب ہو پیدا
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

(۴)

خودی

فانی و باقی گرفتارِ خودی است

دل درونِ سینہ معمارِ خودی است

"پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است

آنچہ می بینی ز اسرارِ خودی است"

درتہی دستی تُرا خود دار کرد

از شرابِ فقر و دیں سرشار کرد

"خویشتن را چوں خودی بیدار کرد

آشکارا عالمِ پندار کرد"

(۵)

عشق

عشق کی تابش سے ہے دامنِ گُل چاک چاک

عشق کے جلووں سے ہے سینہ گناہوں سے پاک

عشق کے دم سے ہوئی عرش کی ہم پایہ خاک

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک

عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق کے حلقے میں ہے جلوہ گہِ ہست و بود

روز و شب و صبح و شام خاک و سپہر کبود

بستہ مسائل کی ہے عشق کے دم سے کشود

عشق فقیہِ حرم عشق امیرِ جنود

عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

(۶)

سلطان ٹیپو کی وصیت

دریا و دشت و کوہ کا حاصِل نہ کر قبول
جو شے نہ ہو مذاق کے قابل نہ کر قبول
تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

مانا کہ راستے کی فضائیں ہیں عطر بیز
مانا کہ ذرّہ ذرّہ ہے ساحل کا کیف ریز
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل اگر عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

تو ذاتِ بے مثال ہے اپنی صفات میں
کوئی نہیں شریک ترا شش جہات میں
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمئ محفل نہ کر قبول

نذرِ اقبال

یہ تینوں شعر ایک مختصر سے مجموعۂ کلام کا انتساب
ہیں جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہو گیا

مجھے شکایتِ بے مائگی نہیں ہرگز
کہ آشنا ہے ترے خُم سے ذوقِ خام مرا
لٹائی تھی جو کبھی ساقیٔ سخن تو نے
اُسی شراب سے ہے مستفیض جام مرا
ترے کلام نے بخشا مجھے مذاقِ سخن
ہے تیری نذر یہ مجموعۂ کلام مرا

ٹیگور کی موت پر

منزلِ پائندہ تر در نگہِ خویش داشت
شاعرِ قدسی نژاد عالمِ خاکی گذاشت

عالمِ خاکی گذاشت ، عالمِ بالا گزید
سوئے گلستانِ خود طائرِ معنی پرید

عالمِ خاکیٔ ما در خورِ طبعش نہ بود
چشم براین خاک پست بر طبقِ آں کشود

بود نہ از خاکِ ما رشتہ و پیوندِ او
از دو جہاں بے نیاز خاطرِ خورسندِ او

بُود در اہلِ وطن بندۂ صاحب نظر

ما ز جہانِ دگر اُو نہ جہانِ دگر

دیدۂ بیدارِ اُو صیرفیٔ کائنات

اُو بہ جہانِ صفات دید تجلّیٔ ذات

برگِ گل و لالہ را دید نگاہش بہ خار

آنچہ نہاں بہرِ ما بر نگہش آشکار

بر نگہش تُوتیا سبزہ و بادِ سحر

شبنم و آبِ رواں اختر و مہر و قمر

عالم در پردۂ بر نگہش بے حجاب

دیدہ اش آزاد از کشمکشِ پیچ و تاب

گلشنِ شعر و سخن از نَفَسش پر بہار

عالمِ رُوحانیاں از نگہش آبدار

مایۂ ہستیٔ اُو عفّتِ قلب و نگاہ

دیدۂ او بود بر آئینۂ مہر و ماہ

از نفسش گُل شدہ غنچۂ دلگیرِ ما

صاحبِ فیضِ نظر راہبرِ پیرِ ما

کشورِ ہندوستاں از عملش سربلند

از ہنرش سرخرو از سُخنش ارجمند

او زکہن عارفاں در وطنم یادگار

گلشنِ افکار از خونِ دلش پُر بہار

بود بہ خاکِ وطن گوہرِ یک دانۂ

گرچہ فقیرے ولے شانِ ملوکانۂ

اہلِ وطن مضطرب، اہلِ جہاں بیقرار

آہ ز تو اے حیات! اے نفسِ مستعار!

۱۹۴۱ء

غزل

دل کی بلندیوں پہ بھی برقِ نظر گرا کے دیکھ
طور کو آزما لیا مجھ کو بھی آزما کے دیکھ

عشق کی رزم گاہ میں کتنا سرور و کیف ہے
عقل کی بزمِ گاہ سے دامنِ دل ہٹا کے دیکھ

کیفیتِ ظن و گماں لطفِ یقیں سے کم نہیں
بزمِ گماں کا رنگ و نور شمعِ یقیں بجھا کے دیکھ

علم ہے کیفِ بے ثبات عشق ہے گرمیٔ حیات
زیست کی یہ حقیقتیں دل کے قریب آ کے دیکھ

رُباعیات

اِن میں سے بعض رباعیات بحرِ ہزج کے ایک مختلف زحاف میں ہیں۔ ممکن ہے بعض سخن فہم حضرات انھیں قطعات کہیں، لیکن میں بابا طاہرؒ اور علامہ اقبالؒ کی تقلید میں انھیں رباعیات ہی سمجھتا ہوں

طوفانِ حیات لے کے آئی ہے سحر
ہر شے پہ سرور بن کے چھائی ہے سحر
کیوں ظلمتِ یاس میں گھرا ہے اے دل
وُہ دیکھ اُفق پہ جگمگائی ہے سحر

جیسے دُرِ عدن سے نکلے
یا لعلِ مین کانِ یمن سے نکلے
یا جیسے شمیمِ گُل چمن سے نکلے
آزاد ہم اس طرح وطن سے نکلے

○

ہو دورِ خزاں میں گُم بہاروں کو نہ دیکھ
گلزار کے شاداب نظاروں کو نہ دیکھ
ذرّوں کو سمجھنے کی ہے توفیق اگر
افلاک پہ تابندہ ستاروں کو نہ دیکھ

ذرّات سے طوفان اُٹھاتا ہُوا چل
ہر نقشِ مخالف کو مٹاتا ہُوا چل
منزل یہ تری دارِ فنا ہے لیکن
اس دارِ فنا میں دندناتا ہُوا چل

گیرم کہ وجودِ من سراپا خاک است
چیزے است دراں کہ غیرتِ افلاک است
مانندِ سرورے کہ نہاں شد بہ شراب
ہمرنگِ شرارے کہ نہاں در تاک است

زمین و آسماں در سینۂ من
مکان و لامکاں در سینۂ من
زبانم دہ کہ پیشِ تو کنم فاش
نمی گنجد فغاں در سینۂ من

○

ہر غنچۂ گل کو نوجوانی دے دے
عالم کو نشاط و شادمانی دے دے
اے ابرِ بہار تیری رحمت کے نثار
مُرجھائے چمن کو زندگانی دے دے

نغمے کے فسوں میں رات ڈوبی آزاد
اک کیف میں کُل حیات ڈوبی آزاد
یہ کس کی ہوئی نوا فضاؤں میں بلند
تاثیر میں کائنات ڈوبی آزاد

○

تجلّی ہے سراپا نور ہے تو
خس و خاشاک میں مستور ہے تو
اگر اپنی حقیقت پر نظر ہو
حریفِ برقِ اوجِ طور ہے تو

دریں بزمِ خس و خاشاک ساماں
ہم آہنگی مکن با خاک اے دل
خجل سازد اختر و شمس و قمر را
نکلا ہے کن سوئے افلاک اے دل

○

کبھی میں ہم کلام اقبال سے ہُوں
کبھی رومی سے ہُوں محوِ سخن میں
مری تنہائی کا عالم نہ پوچھو
کہ تنہائی میں ہوں اک انجمن میں

خرد پابندِ افسونِ جنون است
نگاہم بے قرار و بے سکون است
خداوندا بہ حالِ دل نگاہے
کہ دل از شدّتِ احساس خون است

○

لازم نہیں حُسن کے لئے کوئی بناؤ
ہے حُسن تو محض جِلد کا ایک تناؤ
جیسے کہ جمالِ شعر میں آتا ہے
جس وقت کہ شعر میں ہو لفظوں کا کھچاؤ

بے باک گھٹاؤں کے سلام آئے ہیں
بدمستی و رندی کے پیام آئے ہیں
اے رحمتِ ساقی کو ترسنے والے
وُہ دیکھ چھلکتے ہوئے جام آئے ہیں

○

اُٹھے وُہ فضا میں ہلکے ہلکے بادل
لو شانۂ افلاک پہ ڈھلکے بادل
سرشار جہاں ہُوا ہے دو چھینٹوں سے
ساغر کوئی چھلکا ہے کہ چھلکے بادل

ہر شے کا ہے انداز بدلنے والا
ہر خار ہے گلشن سے نکلنے والا
مشرق کی طرف دیکھ کہ تاریکی میں
اک نُور کا چشمہ ہے اُبلنے والا

○

محبوب ہے احباب میں نامِ آزاد
لبریز مئے وفا ہے جامِ آزاد
جذبات کے ترجمان ہیں اشعار اس کے
خالی ہے قصیدوں سے کلامِ آزاد

غزل

ہر شوق فنا انجام ہوا ہر جذبۂ دل ناکام ہوا

ہر مشکل اب آسان ہوئی ہر درد کو اب آرام ہوا

اب روح کی بے تابی کو تسکین تو ہے آرام تو ہے

مانا کہ جنوں کے سامنے پھر احساسِ خرد ناکام ہوا

اُس جانِ تمنّا سے دُوری الزام بھی ہے انعام بھی ہے

سمجھیں تو یہی الزام ہوا سمجھیں تو یہی انعام ہوا

اِس باغ کا ہے دستور نیا اے دیدۂ دِل ہشیار ذرا
ظاہر کی نہ آنکھیں دیکھیں گی ہم رنگِ زمیں گرد ام ہُوا
کیا سوچ کے جانے آیا تھا انسان بچارا دُنیا میں
مجبورِ طلسمِ صبح ہُوا یا بستۂ فریبِ شام ہُوا

○

از سوزِ دروں پیدا آں طلعتِ زیبا کُن
مہر و مہ و اختر را مصروفِ تماشا کُن
در عشق و خرد اے دل دانی کہ تفاوت چیست
عشق است تماشائے عقل است تماشا کُن

ذرا مرے قریب آ

مری نظر سے دُور ہے مری سمجھ سے ماورا
یہ خامشی کی گفتگو، نگاہ کا یہ سلسلہ
مرے قریب آ کہ میں تجھے ذرا سمجھ سکوں

ذرا مرے قریب آ

جو ہو سکے کبھی ترا مرے مقام سے گذر
تو ہو مری نظر کے اضطراب کو بھی یہ خبر
کہ تیری زندگی کا آسرا خرد ہے یا جنوں

ذرا مرے قریب آ

یہ اور بات ہے مری نظر نے تجھ کو چھو لیا
کبھی کبھی خیالِ بے خبر نے تجھ کو چھو لیا
مری تو انتہا یہ ہے کہ میں بھی تجھ کو چھو سکوں

ذرا مرے قریب آ

ستارہ ہائے ضوفشاں چمک چمک کے بجھ گئے
چراغِ ماہ و کہکشاں دمک دمک کے بجھ گئے
مگر محیط ہے ابھی نگاہ پر کوئی فسوں

ذرا مرے قریب آ

وہ ایک داستاں کہ جو شہیدِ اضطراب ہے
وہ ایک حرفِ آرزو کہ محوِ پیچ و تاب ہے
جو تو ہو مجھ سے اس قدر پرے تو کس طرح کہوں

ذرا مرے قریب آ

غزل

ہُوا معلوم آخر بعدِ صد آزارِ جاں کاہی

کہ ہے دل کی پریشانی مآلِ ذوقِ آگاہی

کچھ اِس انداز سے شیرازۂ گل خاک پر بکھرا

مرے دل کو پریشاں کر گئی بادِ سحر گاہی

نہ چھوڑے اے دل جہانِ شور و شر میں راستہ اپنا

تہِ دریا بھی ہے ذوقِ تجسس رہبرِ ماہی

خدا جانے تری فرقت زیاں ہے سود ہے کیا ہے
تجھے کھویا تو پائی لذتِ آہِ سحرگاہی
نہ منزل کا نشاں پیدا نہ کوئی ہمسفر میرا
بیاباں کی یہ حالت اور میں بھٹکا ہوا راہی

شہنشاہی اسیری ہے دلِ محکوم کے باعث
دلِ آزاد کے دم سے اسیری ہے شہنشاہی

قطعہ

نصف شب کو شہر میں اک آتشیں گولہ پھٹا
شہر کی تاریکیوں میں بجلیاں لہرا گئیں
کیا خبر اس نور میں کتنے شرارے کھو گئے
اس ضیا میں کیسی کیسی صورتیں سنولا گئیں

سلام

سلام اُس ذاتِ اقدس پر، سلام اُس فخرِ دوراں پر

ہزاروں جس کے احسانات ہیں دُنیائے امکاں پہ

سلام اُس پر جو حامی بن کے آیا غم نصیبوں کا

رہا جو بیکسوں کا آسرا مشفق غریبوں کا

سلام اُس پر جو آیا رحمتہ العالمیں بن کر

پیامِ دوست لے کر، صادق الوعد و امیں بن کر

سلام اُس پر کہ جس کے نور سے پُر نور ہے دُنیا

سلام اُس پر کہ جس کے نطق سے مسحور ہے دُنیا

سلام اُس پر کہ جس نے بے زبانوں کو زباں بخشی

سلام اُس پر کہ جس نے ناتوانوں کو تواں بخشی

سلام اُس پر جلائی شمعِ عرفاں جس نے سینوں میں

کیا حق کے لئے بیتاب سجدوں کو جبینوں میں

سلام اُس پر بنایا جس نے دیوانوں کو فرزانہ

مئے حکمت کا چھلکایا جہاں میں جس نے پیمانہ

بڑے چھوٹے میں جس نے اک اخوّت کی بِنا ڈالی

زمانے سے تمیزِ بندہ و آقا مٹا ڈالی

سلام اُس پر فقیری میں نہاں تھی جس کی سلطانی

رہا زیرِ قدم جس کے شکوہ و فرِ خاقانی

سلام اُس پر جو ہے آسودہ زیرِ گنبدِ خضرا
زمانہ آج بھی ہے جس کے در پہ ناصیہ فرسا

سلام اُس پہ کہ جس نے ظلم سہہ سہہ کر دعائیں دیں
وہ جس نے کھائے پتھر، گالیاں اِس پر دعائیں دیں

سلام اُس ذاتِ اقدس پر حیاتِ جاودانی کا
سلام آزاد کا آزاد کی رنگیں بیانی کا

ہم

اپنوں کی بزم سے جو اٹھائے ہوئے ہیں ہم
اغیار میں وقار گنوائے ہوئے ہیں ہم

شاید جو عمر بھر نہ ہمیں یاد کر سکیں
سینے سے اُن کی یاد لگائے ہوئے ہیں ہم

کیا ہو اُمیدِ چشمِ گہر ناشناس سے
موتی ہیں اور مفت لٹائے ہوئے ہیں ہم

اے اہلِ بزم ہم سے یہ آزردگی ہے کیوں
آئے نہیں ہیں کھینچ کے لائے ہوئے ہیں ہم

ہم گردشِ زماں کے ستائے ہوئے نہیں
بے مہریٔ بشر کے ستائے ہوئے ہیں ہم
گو بر ہیں اور کوئی ہمیں پوچھتا نہیں
دامانِ دشت و در میں لٹائے ہوئے ہیں ہم

(۲)

چمکیں گے مثلِ شعلۂ خورشید ایک دن
پھونکوں سے آج اگرچہ بُجھائے ہوئے ہیں ہم
اب بھی وہ رفعتیں ہیں نگاہوں کے روبرو
جن رفعتوں سے آج گرائے ہوئے ہیں ہم
احساس یہ تجھے بھی دلائیں گے ایک دن
اے دوست! تیری بزم میں آئے ہوئے ہیں ہم

جیسے چمن میں رنگِ چمن، رنگ میں سُرور
یوں محفلِ جنوں میں سمائے ہُوئے ہیں ہم
اے برق ہوشیار! ہُوا کیا جو آج کل
تدبیر تری نگاہ کے آئے ہوئے ہیں ہم
اے دشت! رنگ و بُو میں بسائیں گے ہم تجھے
خود جیسے رنگ و بُو میں بسائے ہُوئے ہیں ہم

(۳)

ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملاتے رہے ہیں جو
نغمے وہ اپنے ساتھ ہی لائے ہوئے ہیں ہم
ڈھانپا جنھوں نے روشنیٔ مہر و ماہ کو
پردے وہ مدتوں سے اُٹھائے ہوئے ہیں ہم

نازاں ہے ہم پہ ذوقِ تمدّن کہ آج بھی
مہر و وفا کی بزم سجائے ہوئے ہیں ہم

کانٹوں پہ ہم کو پھینک دیا گرچہ وقت نے
کانٹوں سے دامن اپنا بچائے ہوئے ہیں ہم

بجھنے نہ دیں گے مہر و مروّت کی روشنی
یہ عزم لے کے دہر میں آئے ہوئے ہیں ہم

اے ارتقائے عظمتِ آدم! نہ خوف کھا
سوگند تیرے نام کی کھائے ہوئے ہیں ہم

رُک جاؤ جہل و فتنۂ دوراں کی آندھیو!
کہسار بن کے راہ میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہر سمت سے اگرچہ ہواؤں کا زور ہے
شمعِ خلوص پھر بھی جلائے ہوئے ہیں ہم

*

نانک

گورو نانک! خزاں کے دورِ دوراں میں قدم تیرا
ریاضِ ہند میں آیا بہارِ جاوداں ہو کر
تو اک ابرِ کرم تھا جو زمانِ خشک سالی میں
دیارِ ہند پر برسا محیطِ بیکراں ہو کر
زمینِ کشورِ پنجاب کی تقدیر کیا کہیئے
چمک اٹھا ہر اک ذرّہ حریفِ کہکشاں ہو کر

ترا یُمنِ قدم ہی تھا کہ راہِ عشق و مستی پر

چلا پھر کارواں اپنا امیرِ کارواں ہو کر

یقیں کے رنگ میں درماں تری تعلیم لے آئی

کبھی جب کرب اُٹھّا ذہنِ انساں میں گماں ہو کر

سازِ ہندی

بھگت کبیر کا ایک نغمہ

اے مجھ کو تلاشش کرنے والے

میں تیرے قریب ہوں یہیں ہوں

تیری رگِ جاں سے بھی قریں ہوں

مندر میں نہیں قیام میرا

مسجد بھی نہیں مقام میرا

کعبہ نہیں میرا آستانہ
کیلاش نہیں میرا ٹھکانہ
رسموں میں گھرا ہوا نہیں میں
پردوں میں چھپا ہُوا نہیں میں
اے مجھ کو تلاش کرنے والے
میں تیرے قریب ہوں یہیں ہوں
تیری رگِ جاں سے بھی قریں ہوں

صادق ہے گر اشتیاق تیرا
مشکل نہیں کچھ وصال میرا
اپنا مجھے بیگماں سمجھ تو
اس شوق کو کامراں سمجھ تو

اے دوست! کبیر کا ہے یہ قول
بھارت کے فقیر کا ہے یہ قول
وُہ ذات ہے زندگی نفس کی
وُہ ذات ہے کیا؟ ندا جرس کی

O

تُند گرداب تھا ساحل تھا بہت دُور مگر
نہ تو گرداب سے شکوہ ہے نہ ساحل سے گلہ
خود تمنائے انوار تھے اپنا ہے قصور
اب ہو کیوں برق سے یا برق کے حاصل سے گِلہ

اصغر بشیر

رو رو کے کہہ رہا تھا دلِ غم نصیب یوں

اصغر کی موت سانحۂ جانگداز ہے

یہ بات سن کے صبر نے آہستہ سے کہا

"اللہ تیری ذات بڑی بے نیاز ہے"

اصغر بشیر۔ میاں بشیر احمد (ایڈیٹر ہمایوں) کا فرزند جو
آکسفورڈ سٹریم میں بجر کر جاں بحق تسلیم ہوا۔

غزل

ادھر جلووں کی روز افزوں فراوانی میں جاتی
ادھر اپنی نظر کی تنگ دامانی نہیں جاتی

جہاں سے جب تلک رسمِ جہانبانی نہیں جاتی
یہ انساں کی مصیبت یہ پریشانی نہیں جاتی

میسر نعمتِ آسائشِ جاں آ نہیں سکتی
ترے دل سے اگر حُبِّ تن آسانی نہیں جاتی

بہائم پیشگی نے اس کا وہ حلیہ بگاڑا ہے
کہ اب انسانیت کی شکل پہچانی نہیں جاتی

حریمِ عشق کی حد سے ادھر ہے سب بُت آرائی
بُت آرائی سے آگے عقلِ انسانی نہیں جاتی

وہی بلبل ہے رازِ گلستاں کو جاننے والا
خزاں آنے پہ بھی جس کی خوش الحانی نہیں جاتی

فریبِ منظر

اِک روشنی اُفق پہ نمایاں ہوئی تو تھی
جس سے منظر فروز ہُوا تھا یہ خاکداں
ہر سمت سے اگرچہ ہواؤں کا زور تھا
قندیل سی فضا میں فروزاں ہوئی تو تھی

لیکن وہ ضو کہ جس کو قریبِ نظر کہیں
چشمک تھی برق کی کہ تبسم شرار کا
منزل بھی گم رہی رہِ منزل بھی بے نشاں
اب کیا اُسے چراغِ سرِ رہگزر کہیں

انوار وہ پلٹ کے نہ جانے کہاں گئے
دیکھا تو پھر فضائیں دُھندلکے تھے گرمِ سیر
پردہ سا اک بہ حدِ نظر پھیلتا گیا
جلوے سمٹ کے نہ جانے کہاں گئے

اشعار

فقط حجاب ہیں نظروں پہ اور کچھ بھی نہیں
یہ مہر و مہ یہ ستارے یہ آسماں یہ زمیں
یہ دوستوں کا رویّہ، یہ دشمنوں کا سلوک
جو مجھ سے پوچھ تو دونوں میں کوئی فرق نہیں
غزل یہ جس نے لکھی ہے سلام شوق اُسے
"شرابِ لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں"

ہو جس میں بُوئے وفا اور رنگِ صدق و صفا

ریاضِ دہر میں یارب! وہ پھول ہے کہ نہیں

○

سماج کے اے قدیم ڈھانچے حیات سے تازگی چُرا کر

سنور رہا ہے تو کس لئے تو تجھے تو اب ٹوٹنا پڑے گا

پلانے والے خبر بھی ہے پستی و بلندی روا ہو جس میں

یہ پینے والوں کے ہیں ارادے وہ میکدہ ٹوٹنا پڑے گا

رہے گا بطنِ خضر میں کب تک حیات کے بیقرار لاوے

یہ وقت لے کر پیام آیا کہ اب تجھے پھوٹنا پڑے گا

○

در پیکرِ خاکِ من جانے است گرفتارے

از روزِ ازل نالاں در سازِ دلم تارے

اے عقلِ فسوں پیشہ کردی تو عجب کارے

در دستِ تو تسبیحے بر دوشِ تو زُنّارے

آں حسنِ دلآویزے مجموعۂ اضداد است

دل پارۂ از سنگے رُخ روکشِ گلزارے

اے گیسوئے سحر افزا تابِ تو فزوں بادا

در حلقۂ دامِ تو آزاد گرفتارے

○

جواب گوشۂ زنداں کا گلستاں میں نہیں

مرا قفس میں جو آیا ہے آشیاں میں نہیں

مثالِ لالۂ صحرا ہوں سب سے بیگانہ

میں اِس جہاں میں ہوں لیکن دل اس جہاں میں نہیں

نگاہ ڈال ذرا اپنے دل کی وسعت پر
جو بات اس میں ہے پہنائے آسماں میں نہیں

○

ذوقِ سفر میں حدِّ سفر کیا
یہ کوہ و میداں یہ دشت و در کیا
منزل کو آخر اس کی خبر کیا
آزاد کی ہے حدِّ نظر کیا
اے عزمِ راسخ! اے جذبِ کامل
راہِ طلب میں خوف و خطر کیا
گرداب کیا ہے طوفان کیا ہے
ساحل کو آخر اس کی خبر کیا

نظر نے فاش کیا دل کا راز آخر کار
زباں خموش تھی لیکن فغاں خموش نہ تھی
وُہ مہر و مہ کی تجلّی میں کھو گئی آخر
نظر بلند ارادہ تھی سخت کوش نہ تھی

○

جو ہو سکے تو ہو نوائے شکستِ ساز بھی سُن
نوائے ساز نوائے شکستِ ساز نہیں

○

جنونِ شوق کے آگے خِرد کی کچھ نہ چلی
وگرنہ میں تو کچھ ایسا خِرد سے دُور نہ تھا
سب اپنے دِل کی تجلّی تھی جو نظر آئی
کمالِ شوق تھا سارا کمالِ طور نہ تھا

غرورِ عشق نے روکے رکھا مجھے ورنہ
مری جبیں سے ترا آستانہ دُور نہ تھا

○

عشق فریب دے گیا عقل فریب کھا گئی
آنکھ جھپک سکا نہ شوق ہوش کو نیند آ گئی
کون سا راز پا کے یوں اشک فشاں ہوا چمن
بادِ نسیمِ صبحدم باغ کو کیا بتا گئی

○

حضورِ شمع سے ناکام پروانے نہیں جاتے
کہ جب تک جاں نہیں جاتی یہ دیوانے نہیں جاتے
خدا جانے یہ کیا بجلی گری کیسی سموم آئی
کہ چہرے گلستاں زادوں کے پہچانے نہیں جاتے

بے چین و بے قرار و پریشاں ہے زندگی

اس پر بھی نغمہ ریز و غزل خواں ہے زندگی

○

بار ہا آتا ہے آزاد شکستوں کا خیال

بار ہا دل کے ارادوں پہ ہنسی آتی ہے

○

باغِ عالم میں یہ بیگانہ روی اے آزاد

کیا خبر ہے کہ وہ محبوب کہاں مل جائے

○

زندگانی کا یہ دریا ہے تو گرداب بہت

تو نے اے چشمِ تماشا ابھی دیکھا کیا ہے

یہ سہارے کی تمنّا میں بھٹکتی ہی رہیں
آرزو ہے کہ نگاہوں کو سہارا نہ ملے

○

بیزار ہے دُنیا سے دل ایسا کہ زباں پر
اب شکوۂ بے مہریٔ دنیا نہیں آتا
طوفاں میں ہو ساحل کے سہارے کی تمنّا
اے عقل! جنوں کو یہ سلیقہ نہیں آتا

○

جو تو ہو دُور تو حاصل نہ ہو نظر کو قرار
جو تو ہو پاس تو بے تابیٔ نظر نہ رہے
یہ آرزو ہے کہ تیرا نشاں کہیں مل جائے
نہیں ہے غم اگر اپنی ہمیں خبر نہ رہے

تری تلاش کی وادی میں چلنے والوں کو
عجب نہیں اگر اپنی بھی کچھ خبر نہ رہے

○

ممکن ہے کہ یہ طوفاں اے دل طوفاں ہو کسی کی رحمت کا
کیوں آج سفینے والے خود طوفاں کی تمنّا کرتے ہیں

○

ساز کے پردوں میں نغمہ اس طرح پوشیدہ ہو
ساز جس دن ٹوٹ بھی جائے صدا باقی رہے

○

ہنوز رشتہ بپا بند طائرانِ چمن ؟
بگو نسیمِ سحر کز چمن بروں آئی

مرا بس ہر ایک شجر پہ تھا مرا حق تھا ہر گُل و خار پر
وہ زمانہ خواب ہُوا کہ جب مری دسترس تھی بہار پر

○

کبھی مانوس دُنیا سے کبھی مایوس دُنیا سے
گزاری اس طرح آزاد نے عمرِ رواں اپنی

○

شبِ فراق کی تاثیر دیکھنے والے
اب اور بھولنے والے کا انتظار نہ کر
چمن میں آ مگر اس کی فضا سے دل نہ لگا
ٹھہر نہ صحنِ چمن میں گلوں سے پیار نہ کر
خزاں بھی صحنِ چمن میں نہیں قرار نصیب
خزاں کے دور میں اے دل غمِ بہار نہ کر

ندی نالے منزل پا کر اپنی ہستی کھو بیٹھے
چاند ستارے گرمِ سفر ہیں ان کی منزل کوئی نہیں
حیراں ہو کر دیکھنے والے فکر و نظر سے کام نہ لے
عشق ہے وہ ذخّار سمندر جس کا ساحل کوئی نہیں

غزل

اب یاد نہیں ہر صبح تری اب ذکر نہیں ہر شام ترا

اس پر بھی مگر آجاتا ہے اے دوست زباں پہ نام ترا

اے نور کے ذرّے سامنے تو اک نور کا دریا بہتا ہے

اے صبح کے تارے تجھ کو بھی معلوم ہے کچھ انجام ترا

اُلفت میں سراپا درد بنا اب اور تمنّا کیا ہے تری

اے درد پہ مٹنے والے دل! اب درد ہے خود انعام ترا

اے جوشِ جنوں ادراک نے تو ہر گام پہ ٹھوکر کھائی ہے
گو اس نے سنی آواز تری سمجھی نہ مگر پیغام ترا
آزاد کو جانے کیا سمجھے ہر پھول چمن میں بول اٹھا
ہم چاک گریباں والوں کی محفل میں بھلا کیا کام ترا

○

کمزور جان کر بھی تجھے اے غمِ فراق
دِل نے لیا ہے تیرا سہارا کبھی کبھی

دائرے

دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر
اُجلے اُجلے دُھندلے دُھندلے مٹتے مٹتے دائرے
کون سے نقطے سے ہے آغاز ان کا کیا خبر
اور کہاں انجام ہے یہ بات بھی پوشیدہ ہے

دائرے ہیں یہ کہ زنجیریں تخیّل کے لئے
فکر کو پابند کرنے میں جو ہیں ناکامیاب
دائرے ہیں یہ کہ سیمیں جال ہیں پھیلے ہوئے
طائرِ ادراک جن سے اُڑ رہا ہے دُور دُور

دائرے — روشن کہیں دُھندلے کہیں اوجھل کہیں
جیسے ماضی کے دُھندلکوں میں نمایاں ہو کبھی
یاد اُن چھوٹے ہُوئے بیسرے ہوئے احباب کی
گردشِ دَورِ زماں نے آج پھینکا ہے جنھیں
دُور آنکھوں سے تمنّا کی رسائی سے پرے

دائرے تابندہ و رخشندہ و بے نور سے
ہاں یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تاحدِّ نظر

دائرے اُلجھے ہُوئے باہم سمٹتے پھیلتے
تیز رفتار اِن میں کوئی اور کوئی سست رو
پھر بھی سب باہم رواں اندازِ ہم آہنگ سے

ابتدا اور انتہا کی قید سے آزاد ہیں
چشمِ بینا کو گماں ہوتا ہے ان کو دیکھ کر

دائرے جن کے تسلسل کا سِرا نایاب ہے
بس یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر

دو شعر

عزمِ سفر! ذرا ابھی اور بھی تیز تیز چل
تیرا مقامِ ذوق و شوق دور بھی ہے بلند بھی

عقل کی انتہا ہے کیا عقل فقط گرہ کشا
عشق گرہ کشا بھی ہے اور گرہ پسند بھی

سکوت

وقت نے باغ میں چھیڑا ہے پھر افسانۂ حسن

چاندنی رات، دلآویز فضا

ذرہ ذرہ کاہکشاں

پھول --- بشاش و ملول

چند خاموش سے کردار ہیں افسانے کے

یہ فسانہ کہ کسی قید کا پابند نہیں

یہ فسانہ کہ ازل سے ہے ابد تک جاری
چھا گیا آج کی رات
بن کے احساس دلِ شاعر پہ
جاذبیت کا وہ عالم ہے اس افسانے میں
کہ گماں ہوتا ہے
میں بھی اک جزو ہوں شاید اِسی افسانے کا

○

بہار آئی ہے اور میری نگاہیں کانپ اٹھی ہیں
یہی تیور تھے موسم کے جب اُجڑا تھا چمن اپنا

غزل

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں

یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے
نزدیک آ سکوں نہ کہیں دُور جا سکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے گرے ہیں وُہ کہ نہ جن کو اُٹھا سکوں

تاروں کی گردشوں کا اڑاؤں مذاق میں
میں تم کو ایک بار جو واپس بلا سکوں

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آ سکوں

اس بزم میں جہاں نہ عدم ہے نہ ہے قتیل
میرا قصور کیا جو ترا سے نہ گا سکوں

تیری حسیں فضا میں مرے اے سنئے وطن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں

آزاد! سازِ دل پہ ہیں رقصاں وہ زمزمے
خود سُن سکوں مگر نہ کسی کو سُنا سکوں

نیا دور نئے رہزن

یہ کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے اے دوست!

چور گلشن سے اگر پھول چرا لیتے ہیں

حادثہ ہے یہ مگر اس پہ تعجب تو نہیں

راہ زن قافلے والوں کو اڑا لیتے ہیں

اس نئے دور میں دیکھے ہیں وہ رہزن ہم نے
جو بہاروں کو گلستاں سے چرا لے جائیں
دیں نگاہوں کو جو دھوکا تو پتہ بھی نہ چلے
اور ضوِ انجمِ تاباں سے اڑا لے جائیں

اس طرح ان کی نظر پھول پہ ڈاکہ ڈالے
پھول موجود رہے پھول ہاں خوشبو نہ رہے
حسن کی آنکھ سے وہ تیری طرف دیکھ جو بس
ترا پیکر رہے موجود مگر تو نہ رہے

قعرِ دریا میں اُتر جائیں تو انجام یہ ہو

قعرِ دریا میں صدف تو رہے گوہر نہ رہے

اور مائل جو ترے ذہن پہ ہو اُن کا دماغ

ذہن میں تیرے عَرَض تو رہے جوہر نہ رہے

کسی ماحول کے پابند نہیں ہیں یہ لوگ

ایسے لوگوں کی ہے ہر گوشۂ عالم میں نمود

بزم میں دیکھنا چاہیے تو وہاں مِل جائیں

رزم میں ڈھونڈنا چاہے تو وہاں بھی موجود

اس نئے دور میں لکھنا ہے یہی تجھ سے مجھے

کہ ترا ہوش رہے راہزنوں سے محتاط

تیری محنت جو ترے حق میں ہے سامانِ الم

ہو کہیں اور نہ وہ خالقِ سامانِ نشاط

زندگی پاس ہے مجھ کو تری مجبوری کا

ورنہ اظہارِ غمِ دل کوئی مشکل تو نہیں

پناہ گزیں

خموشیوں میں حادثوں کی داستاں لئے ہوئے
دلِ حزیں میں درد و غم کا اک جہاں لئے ہوئے
نگاہ میں حدیثِ جورِ دوستاں لئے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ

مکاں کسی کا جل گیا کسی کا گھر اجڑ گیا
کسی سے کوئی زندگی کا آسرا بچھڑ گیا
لٹی ہوئی بجھی ہوئی جوانیاں لئے ہوئے

رواں ہے ایک قافلہ

اگرچہ دور آچکے دھڑک رہے ہیں دل ابھی
قدم میں کپکپی سی ہے نظر ہے مضمحل ابھی
خموش لب پہ حشرِ نالہ و فغاں لئے ہوئے

رواں ہے ایک قافلہ

کبھی کبھی نگاہ میں امید بھی ہے یاس بھی
نظر میں حوصلے بھی ہیں محیط ہے ہراس بھی
غرض عجیب رنگ کی کہانیاں لئے ہوئے

رواں ہے ایک قافلہ

بیانِ نطق میں زبانِ شعر میں نہ آ سکے
جسے فقط نگاہِ غم نصیب ہی سُنا سکے
تباہیوں کی وہ مہیب داستاں لئے ہُوئے
رواں ہے ایک قافلہ

رُباعی

ماضی کی یاد غم بڑھاتی ہی رہی
سوئے ہوئے ارمان جگاتی ہی رہی
مرطوب فضا میں سانس گھٹتا ہی رہا
خوشبو بدنِ دوست سے آتی ہی رہی

غزل

کہوں کیا کہ عشق کیا ہے عجب اس کا ہے فسانہ

کبھی زیست کا سہارا، کبھی موت کا بہانہ

ترے آستاں کو چھوڑا تو ملا نہ پھر ٹھکانہ

وہی کاوشِ مسلسل، وہی گردشِ زمانہ

کبھی گلستاں کو جانچا، کبھی کہکشاں کو پرکھا

مرے ذوقِ جستجو کو نہ ملا کوئی ٹھکانہ

یہ چمن بھی کیا چمن ہے نہیں ہمصفیر کوئی
میں سناؤں بھی تو کس کو یہ نوائے عاشقانہ

تجھے کیا بتاؤں ہمدم اِک قفس میں کیا کشش تھی
یہ بجا مری نظر سے نہ پرے تھا آشیانہ

یہ بجھی بجھی فضائیں یہ گھٹا گھٹا سا عالم
مرے منطق! چھیڑ کوئی طرب آفریں ترانہ

نہ الم ہے دوش کا کچھ، نہ کچھ اشتیاقِ فردا
یہ جو آج سامنے ہے یہی ہے مرا زمانہ

شاعر

تجھ کو قدرت نے اگر بخشا ہے قلبِ دردمند
تُو اگر شاعر ہے اور تجھ کو صداقت ہے پسند
تو ذرا تھم اور توجہ سے مری آواز سُن
ہاں مری آواز یعنی وقت کی آواز سُن
خطۂ کشمیر میں جو کچھ ہُوا اُس کو نہ دیکھ
صُبح کی تزویر میں جو کچھ ہُوا اُس کو نہ دیکھ

سرزمینِ کشورِ پنجاب کے نالے نہ سُن

عقل کے شیون دلِ بے تاب کے نالے نہ سُن

کان تو ہرگز نہ دے بیواؤں کی فریاد پر

اور یتیموں کی فغاں سے بے نیازانہ گزر

بھول کر بھی تو نہ ڈال ارضِ فلسطیں پر نگاہ

تاکہ سہواً بھی ترے دل سے نہ نکلے ایک آہ

سامنے گر چین کا نقشہ بھی ہو پروا نہ کر

ہندِ چینی کے مقدّر کا خیال اصلا نہ کر

وقت لے آئے جو تیرے سامنے تصویرِ دہر

صاف کہہ دے کام شاعر کا نہیں تعمیرِ دہر

قتل و خوں یونان کا، ایران کا یہ پیچ و تاب

جنگِ برما، خاکِ انڈونیشیا کا اضطراب

یہ تماشے دیکھتا جا اور منہ سے کچھ نہ کہہ
سینۂ گیتی دھڑکتا دیکھ اور خاموش رہ

اور اگر کہنا ہو کچھ اپنے وطن کی شان میں
راز کی اک بات میں کہتا ہوں تیرے کان میں

یہ نہ کہہ انگریز یا باطن کا ہے سارا قصور
بلکہ ہندو ہے تو کہہ یہ ہے مسلماں کا قصور

اور سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو مسلم اگر
تو مناسب ہے کہ سب الزام دے ہندو کے سر

دیکھ اپنے آپ کو شہری نہ دنیا کا سمجھ
قوم کی زنجیر میں جکڑا ہوا بندہ سمجھ

بس سخن گوئی کا یہ معیار یہ پیمانہ ہے
تو اگر قائل نہیں اس کا تو پھر دیوانہ ہے

ہاں اسی معیار سے عالم کے ہر پہلو کو ناپ
زندگانی کی خوشی اور غم کے ہر پہلو کو ناپ
اس سے تیرا قوم میں اونچا نشاں ہو جائے گا
کامراں فن ہو نہ ہو تو کامراں ہو جائے گا

۱۹۴۳ء

غزل

نہ پہنچیں گی نگاہیں ماورائے آسماں کب تک
رہے گا راہ میں حائل غبارِ کہکشاں کب تک

وطن کہتے تھے جس کو چھٹ گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ رہتے ہیں دیارِ غیر میں ہم میہماں کب تک

قفس کی دلکشی میں تو کمی کوئی نہیں لیکن
نہ آئے گی قفس میں رہ کے یادِ آشیاں کب تک

ذرا اتنا تو فرما دے کہ منزل کی تمنّا میں
بھٹکتے ہم پھریں گے اے امیرِ کارواں کب تک

زباں بن کر شہیدوں کا لہو اک دن پکارے گا
رہے گی شاخِ آہو پر براتِ عاشقاں کب تک

خزاں آئی گلستاں میں تو ہم سمجھے بہار آئی
نگاہِ شوق آخر یہ تری خوش فہمیاں کب تک

زباں سے آگ برسانا پڑے گی اس گلستاں میں
یہاں اے ہم نفس پابندیٔ رسمِ فغاں کب تک

بہ ذوق و شوق بحرِ عشق میں اے کودنے والے!
یہ عالم ہے تو پھر اندیشۂ سود و زیاں کب تک

ذرا سوچو تو اے منزل کا رستہ بھولنے والو!
بالآخر آزماؤ گے جفائے دشمناں کب تک

یہ اپنی منزلِ مقصود پر کب تک نہ پہنچے گا

فریبِ رنگ و بُو کھائے گا آخر کارواں کب تک

بشر کو بھی کبھی تو موردِ الزام ٹھہرا دے

یہ نادِل شکوۂ جور و جفائے آسماں کب تک

تعجب ہے پتہ خود باغبانوں کو نہیں اس کا

رہے گا اس طرح برہم مزاجِ بوستاں کب تک

اسیرانِ طلسمِ وہم سے آزاد یہ کہہ دو

یہ رنگ و نور و نکہت کا ہجومِ بیکراں کب تک

آزاد و اقبال

آزاد

ذلیل و خوار ہیں اہلِ ہُنر کیوں
جہاں نا قدرداں ہے اس قدر کیوں
جو کوسوں دور ہیں علم و ہُنر سے
وُہی ہیں صاحبِ لعل و گہر کیوں

اقبال

قماش و نقره و لعل و گهر چیست
غلامِ خوش گل و زرّیں کمر چیست
چو یزداں از دو گیتی بے نیاز ند
دگر سرمایۂ اہلِ ہنر چیست

آزاد

علومِ عصرِ نو دیوانہ ام کرد
زِ شوقِ زندگی بے گانہ ام کرد
فغاں از شعبدہ بازئ افرنگ
حقیقت بودم و افسانہ ام کرد

اقبال

خودی را نشئہ من عین ہوش است
ازاں پیمانۂ من کم خروش است
مئے من گرچہ ناصاف است در کش
کہ ایں تہ جرعۂ خم ہائے دوش است

غزل

اب دُور ترے فہم سے ہے میری کہانی

ہر لفظ نے تبدیل کئے اپنے معانی

افکار سے انساں کو بقا بھی ہے فنا بھی

فانی ہیں جو افکار ترے تو بھی ہے فانی

"تا حدِ نظر اب ہے اندھیرا ہی اندھیرا"

یہ ذوق ہے مٹتی ہوئی دُنیا کی نشانی

اے ارضِ جہاں کس کی ضرورت ہے تجھے اب

آنسو کا یہ پانی ہے یہ تلوار کا پانی

بہبودِ بشر کے یہ اگر کام نہ آئی

کس کام کی اے ذوقِ سخن تیری جوانی

اے شاعرِ امروز کر انساں سے تخاطب

افلاک پہ اب فاش نہ کر رازِ نہانی

جس نظم میں موجود نہ فردا کی تڑپ ہو

وہ نظم ہے آزاد فقط مرثیہ خوانی

اُردُو

پہلی بار مارچ ۱۹۵۱ء

دوسری بار دسمبر ۱۹۵۲ء

تیسری بار جولائی ۱۹۵۴ء

پرنٹر:۔ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پبلشر:۔ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی

اُردو

جو آزاد نے ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اردو مجلس دہلی
کی پہلی سال گرہ کی تقریب پر جب کہ تقسیم ہند کے
بعد پہلی بار دہلی میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کی شاخ قائم
ہوئی خواجہ حسن نظامی کی زیرِ صدارت ڈیویز ہال میں پڑھی۔

اِس حقیقت کے نام

کہ اردو ہندوستان کی ایک ترقی یافتہ

اور ترقی پسند زبان ہے اور ہندوستانی

تہذیب و تمدّن کا باغ اِس پھول کے بغیر

کسی طرح مکمل نہیں سمجھا جا سکتا

پیش نامہ

صرف یہ کہنا بالکل کافی نہیں ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم بہت اچھی ہے۔ میں حال ہی میں آزاد کی شاعری سے آشنا ہوا ہوں۔ گذشتہ اگست میں میں نے ان کے مجموعۂ کلام "بیکراں" پر ہماری زبان میں مختصراً اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا تھا کہ "آزاد ہندوستان کے اس دوسرے جنم کے نقیب ہیں لیکن وہ اس کے قائل نہیں کہ ایک ہی قدم ہمارے لئے بس ہے۔ وہ آزاد ہندوستان کی آزادی سے بھی کچھ آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔" میرا مطلب یہ تھا کہ ہماری آزادی کی تکمیل — ذہنی، سماجی اور اخلاقی — ابھی باقی ہے اور اس تکمیل کے لئے "ہماری نئی دنیا کے نئے ادب اور شعر کے نئے پیمبروں اور نئے اقداروں کی ضرورت ہے۔" آزاد کے کلام کا اس قدر گہرا اثر میرے دل پر اس لئے پڑا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء کے فرقہ داری فتنہ کی آگ میں گذر کر اور آوارۂ وطن ہو کر ہندوستان آئے اور پھر بھی ادنیٰ تعصبات کی اس گندگی سے انہوں نے اپنا دامن بچا لیا جس سے آج بہت سے دامن آلودہ ہیں۔ یہ شخصی کردار کا ایک بہت بلند مقام ہے!! ایک ایسے شاعر کی آواز کو محض شاعرانہ سخن آرائی تو نہیں کہہ سکتے! وہ تو غیب کی آواز ہے، وہ تو زندگی کی

ایک نوید ہے!

یہ نظم جو اب شائع ہوتی ہے اُردو زبان کے متعلق آزاد کی بلند نظری کا ایک نقش ہے، جس کی تعریف میں اس لئے نہیں کرتا کہ میری مادری زبان اُردو ہے یا میں انجمن ترقیِ اُردو کا سکرٹری ہوں بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ یہ نظم اُردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ کا ایک جزو ہے اور اس میں ہمیں اس حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے کہ اُردو ہمارے ملک کی مشترکہ زبان تھی اور ہے۔ اس کے چہرے کو آج ہمارے ملک کے بہت سے لوگ دیکھنا پسند نہیں کرتے، لیکن تاریخ اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کرکے انکار کر دینا اُن کو باطل نہیں کر سکتا! تاریخ کے گواہ تصنع پسند اور تنگ نظر سیاست کی سخت ترین ضربیں کھا کر بھی زندہ رہا کرتے ہیں۔

آزاد کی ذہنی زندگی روشن اور تاباں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی رہے گی، گرد و غبار سے پاک! اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اُن کے چراغ سے ہزاروں چراغ ہمارے عزیز وطن میں روشن ہوں گے اور ایک دن آئے گا کہ اس ملک میں شاعروں کی شاعری اور ادیبوں کا ادب عوام کی زندگی کا اس طرح آئینہ دار ہوگا کہ پھر عکس کو آئینہ سے جُدا نہ کیا جا سکے گا۔

(قاضی) محمد عبدالغفار

علی گڑھ
۳۰ دسمبر ۵۸ء

طبع ثانی

اس نظم کا دوسرا ایڈیشن میں کسی قدر اضافے کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ اکثر شعراء اور ادبا کے نام جو اصل نظم میں موجود نہیں تھے اب بڑھائے گئے ہیں۔ آخر میں ایک تعارف نامہ بھی شامل کر دیا گیا ہے تاکہ جس شاعر اور ادیب کا ذکر نظم میں آیا ہے اُس کے ادبی کارناموں سے بھی پڑھنے والے کو واقفیت ہو سکے۔

دو باتوں کی جانب یہاں میں خاص طور پر ناظرین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ فن کاروں کے ناموں کے ذکر میں کسی تاریخی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ جیسے جیسے فن کاروں کے نام خیال میں آتے گئے وہ نظم میں شامل ہوتے گئے۔ تاریخِ ادب کی کسی کتاب کو سامنے رکھ کر شعر کہنا میرے بس میں نہ تھا۔ اسی لئے ممکن ہے بعض اہم نام اس نظم میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔

دوسری بات ان فن کاروں کی کتابوں کے متعلق ہے۔ کوشش میں نے یہ کی ہے کہ ان مصنفوں کی تمام کتابوں کا ذکر آجائے لیکن چونکہ یہ فہرست بھی میں نے اپنی یادداشت سے مرتّب کی ہے، لہٰذا اس کے مکمل ہونے کے متعلق بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے بعض اہم کتابیں درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔

لیکن چونکہ نظم پیش کرنے کا مقصد مصنفوں یا کتابوں کے نام گنوانا نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ اُردو کسی ایک طبقے کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ سارے ملک کی زبان ہے اور اس کی پرورش میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے حصّہ لیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ناموں کی کمی بیشی مقصد کی صداقت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

دہلی - ۲۴ جنوری ۱۹۵۲ء

آزاد

طبع سوم

اس ایڈیشن میں تعارف نامہ حذف کر دیا گیا ہے

آزاد

دہلی
یکم فروری ۱۹۵۴ء

تمہید

غالباً یہ ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ انجمن ترقی اُردو لائل پور نے علّامہ برج موہن کیفی کے اعزاز میں ایک، ادبی جلسہ منعقد کیا تھا اور مجھے لاہور سے اس جلسے میں شرکت کی دعوت دی تھی میں بالعموم مخصوص تقریبوں میں اپنی عام ادبی چیزیں پڑھ دیا کرتا ہوں۔ لیکن اس تقریب کے لئے میں نے خاص طور پر ایک نظم لکھی۔ بدقسمتی سے میں جس وقت لائل پور پہنچا تقریب ختم ہو چکی تھی اور میرے میزبان تقریب میں شرکت کے بعد گھر واپس آچکے تھے۔ مجھے اس محفل میں شریک نہ ہونے کا افسوس ہوا اور نظم کاغذات ہی میں دھری رہ گئی۔

۱۹۴۷ء میں میں لاہور سے چلا تو اس بے ترتیبی سے کاغذ جمع کئے کہ اکثر کام کی چیزیں کتابیں، مسوّدے وغیرہ وہیں رہ گئے اور ردی کاغذات کے پلندے جلدی میں جمع کی ہوئی چیزوں کے ساتھ یہاں دلّی آگئے۔ چند ماہ ہوئے یہ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے یہ نظم برآمد ہوئی اور اس خیال کے پیش نظر کہ نئے حالات میں اس کی اہمیت شاید کم نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اسے موجودہ صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ تمہید اس لئے لکھی ہے کہ پڑھنے والے اس نظم کو تازہ نہ سمجھیں، کیونکہ اُردو

۔سے جو توقعات اس نظم میں وابستہ کی گئی ہیں اُن میں سے اکثر پوری نہیں ہوئیں، ہاں جن جذبات کا میں نے اظہار کیا ہے وہ آج بھی میرے ہیں اور تقسیمِ ہند اور اس سے پیدا ہونے والے واقعات اُنھیں مجھ سے چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

دہلی
دسمبر ۴۷ء

آزاد

اُردو

سُنا ہے ہند پہ یوں حکمراں تھی آلِ تیموری

کہ مُلک اک جسم تھا اور اُس میں جاں تھی آلِ تیموری

یہ تھا دَور آدمیّت کا، شرافت کا، مروّت کا

وطن میں یہ زمانہ تھا، زمانہ امن و راحت کا

ہوئیں شیر و شکر اس طرح دو اقوام آپس میں

کہ پھیلیں ہر طرف ہندوستاں میں پیار کی رسمیں

اکٹھے ہندو و مسلم شریکِ حکمرانی تھے

وطن کے پاسباں مل جل کے محوِ پاسبانی تھے

اِدھر بھی اک تمدن تھا اُدھر بھی اک تمدن تھا

نظر آیا وطن کی سرزمیں پر اک حسیں نقشہ

نہ کیوں اُس گلستاں میں ارتقاء کے پھول پیدا ہوں

جہاں پہلو بہ پہلو دو تمدن کار فرما ہوں

جہانِ علم پر چمکے مثالِ کہکشاں ہندی
حکومت کی زباں تھی فارسی اپنی زباں ہندی

عنادل نغمہ آرا تھے ادب کے گلستانوں میں
اضافہ ہو رہا تھا اس طرح دونوں زبانوں میں

مگر اس میں قباحت کا بھی اک پہلو نظر آیا
عمل کی زندگی میں جو مسلسل مشکلیں لایا

ملے ہندوستانی سے جو باہم ترک و ایرانی
تو مشکل ہوگئی اک دوسرے کو بات سمجھانی

بہت مشکل نظر آیا یہ باہم ربط کا عالم

"زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم"

خلوصِ قلب سے لیکن یہ مشکل حل ہوئی آخر

نئی اک گفتگو کی طرز دونوں کو ملی آخر

وہ طرزِ گفتگو آزاد! کچھ ایسی حسیں نکلی

کہ اِن دونوں زبانوں سے زیادہ دل نشیں نکلی

کیا "اُردو" بالآخر وقت نے تجویز نام اس کا

مروت اس کا شیوہ تھا جہانگیری تھا کام اس کا

یہ عقدہ حل کیا جس نے وہ دورِ شہجہانی تھا

یہ دورِ شہجہانی تھا کہ لطفِ آسمانی تھا

ہمارے دیس کے اُجڑے گلستاں میں بہار آئی

ہوئی اک طرزِ نَو پر اس وطن میں محفل آرائی

مگر دورِ فلک کو یہ طریقہ ناپسند آیا

محبّت کا، مروّت کا سلیقہ ناپسند آیا

حقیقت ہو گئی پنہاں فسانے ہو گئے پیدا

لڑائی اور جھگڑے کے بہانے ہو گئے پیدا

نتیجہ یہ ہوا افسانہ بن کر رہ گئی اُلفت

بس اک ٹوٹا ہوا پیمانہ بن کر رہ گئی اُلفت

ہوائے وقت نے تاریخ کا جس دم ورق اُلٹا

تو یاروں کی زبانوں پر نظر آیا سبق اُلٹا

نگاہوں میں محبّت کی جگہ نفرت نظر آئی

تجلّی گُم ہوئی چاروں طرف ظلمت نظر آئی

ہوئے نُصرت نصیب اس طرح سے آفت کے پرکالے

محبّت کھیل ہاری اور جیتے دشمنی والے

یہی وہ دَورِ نو ہے جس میں ہم اب سانس لیتے ہیں

اسی کیچڑ کی ندی میں ہم اپنی ناؤ کھیتے ہیں

یہی وُہ دَور ہے ورثے میں جو اب ہم نے پایا ہے

کسی سے کیا کہیں کیا ہم نے پایا کیا گنوایا ہے

یہی وُہ دَور ہے جس پہ تمدّن ناز کرتا ہے

اسی کا لمحہ لمحہ عرش تک پرواز کرتا ہے

یہی وُہ دَور ہے جس کو بڑی جدّت کا دعویٰ ہے

بڑی جدّت کا دعویٰ ہے بڑی ندرت کا دعویٰ ہے

نہ اب وہ پیار کی باتیں نہ وہ اخلاص باقی ہے

نہ اب وہ پینے والے ہیں نہ وہ مے ہے نہ ساقی ہے

صفا و صدق جو مفقود ہیں آج اپنے سینوں سے

کبھی وہ دن بھی تھے ظاہر تھے جب اپنی جبینوں سے

مگر اِک چیز بچھڑوں کو ملا سکتی ہے جواب بھی

ہمارے ملک کی بگڑی بنا سکتی ہے جواب بھی

مِلا سکتی ہے جو، وہ صدق کی زنجیر باقی ہے

جو دیکھیں غور سے اے دوستو! وہ تعمیر باقی ہے

بنا رکھی گئی تھی جس کی دورِ شہجہانی میں

مگر افسوس اب یورش ہے جس پہ بدگمانی میں

یہ وہ شے ہے جو لائے ایک مرکز پر حریفوں کو

مئے کہنہ پلائے ایک مرکز پر حریفوں کو

غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی

یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلّم پیار کی بولی

ذرا اے معترض! اک لمحہ کی زحمت گوارا کر

مرے ہمراہ آ اور بزمِ اُردو کا نظارا کر

یہ وہ محفل ہے جس میں برق، چکبست و سرور آئے

کہ جن کے شعر پڑھ کر فکرِ انسانی میں نور آئے

یہ وہ محفل ہے زینت جس کی ہے سرشار کے دم سے

نسیمِ خوش بیاں کی طبعِ گوہر بار کے دم سے

جمالستان کا محرم فراق اس میں نظر آئے

یہ وہ محفل ہے نفتہ سا سخنور جس کو اپنائے

مرے والد سا بھی فن کار اس محفل میں شامل ہے

وفا ایسا فسوں گفتار اِس محفل میں شامل ہے

ہری چند اختر اس میں عرش اس میں جوش ہے اس میں

شرابِ علم و فن کا آج ہر مدہوش ہے اس میں

ہے افسانہ طرازِ بزمِ گیتی پریم چند اس میں

پرافشاں ہیں نظر کے نغمہ ہائے دردمند اس میں

منوّر جلوہ گر اس میں نظر شعلہ طراز اس میں

اُفق کے دل سے اُٹھے نالہ ہائے جانگداز اس میں

گہر کی آب اس میں مہر کی تابندگی اس میں

عیاں ہے امن کے اشعار کی رخشندگی اس میں

نجمؔ نے اور جواہر سنگھ نے اس کو سنوارا ہے

کشن پرشاد سا فن کار اسی گردوں کا تارا ہے

بلندی اوج کے افکار کی ہے جلوہ گر اس میں

یہیں اعجاز معجز ہے وفا کا ہے اثر اس میں

اسی محفل میں دیکھی اہلِ دل نے دل کی بیتابی

نظر آئی اسی میں گلشنِ مخلص کی شادابی

تسلّی کی نوا اس میں رواں روحِ رواں اس میں

مدن کی اور ساحر کی بلندی کا نشاں اس میں

اسی میں کیفِ دیوانہ اسی میں جذبِ پروانہ

اسی محفل کا لکھا صدرؔ نے جوہر سے افسانہ

ہُوا بیدارئ آتش بیاں شعلہ طراز اس میں

سُنائے برہمن نے نغمہ ہائے دل نواز اس میں

یہاں موجود ہے بیدی، اوپیندر ناتھ ہے اس میں

کنہیا لال ہے اس میں مہندر ناتھ ہے اس میں

کوشلیا، ساگر اور بلونت سے ہیں پختہ کار اس میں

ہُوئے ہیں کرشن سی ہستی کے جوہر آشکار اس میں

مجھے بھی دیکھ میں بھی نغمہ خواں اس انجمن میں ہوں

(مجھے بھی ہے یقیں اس بات کا اپنے چمن میں ہوں)

یہاں ستیارتھی بھی، ریوتی بھی اور سعد بھی ہے

یہ محفل اپنی منزل بھی ہے اپنی رہگزر بھی ہے

یہاں مخمور بھی ہے شاد بھی ہے اور مُتسّل بھی

یہاں ہے تاجور بھی فکر بھی مضطر بھی دُگل بھی

اسی محفل میں مُلّا کے سکوں پرور ترانے ہیں

اسی میں ضو فگن پرکاش پنڈت کے فسانے ہیں

فسانے اس میں رہبر کے مضامیں اس میں شیدا کے

ہر اک جانب ہیں رقصاں ولولے شوقِ تمنّا کے

یہ وہ محفل ہے جس کا صدرِ محفل آج ہے کیفی

ہمارے ملک کے شعر و ادب کا تاج ہے کیفی

وہ کیفی ناز فرماتا ہے آج اردو ادب جس پر

علمبردارِ حکمت کاروانِ فکر کا رہبر

اسی کے دم سے دیکھ آج اس بھری محفل کا نظارا

یہی ہے آسمانِ علم کا روشن تریں تارا

کیفی

سلام اے محسنِ اردو! سلام اے حامیٔ اردو
بدل ڈالی ہے تو نے حُسن میں ہر خامیٔ اُردو
اسے تو نے کچھ اس انداز سے سانچے میں ڈھالا ہے
کہ اب چاروں طرف اُردو زباں کا بول بالا ہے
بجا ہے گر تجھے معمارِ تعمیرِ ادب کہئے
تجھے فخرِ زبانِ ہند، توقیرِ ادب کہئے

سلام اے حامئ اُردو! سلام اے محسنِ اُردو!

ترا ہر نقش ہے نقشِ دوام اے محسنِ اُردو!

تری تقریر پہ اُردو زباں خود ناز کرتی ہے

تری تحریر پہ طرزِ بیاں خود ناز کرتی ہے

اسی کیفی، اسی فخرِ ادب کی ہے زباں اُردو

عداوت کی فضا میں ہے محبّت کا بیاں اردو

اسے اہلِ وطن دیکھیں نہ ہرگز بدگمانی سے

کہ دُھل کر آئی ہے یہ زمزم و گنگا کے پانی سے

ریاضِ دہر میں اُردو وہ اک خوش رنگ پودا ہے

جسے خونِ جگر سے ہندو و مسلم نے سینچا ہے

مرے اہلِ وطن یہ آدمیّت کا تقاضا ہے

محبّت کا، حمیّت کا، شرافت کا تقاضا ہے

کہ ہم پامالِ جورِ آسماں ہونے نہ دیں اس کو

خزاں کے دور میں وقفِ خزاں ہونے نہ دیں اس کو

وطن بھی ایک ہے اپنا زباں بھی ایک ہو اپنی

چمن جب ایک ہے طرزِ بیاں بھی ایک ہو اپنی